مضامین سیرت صلی اللہ علیہ وسلم

اخلاق حسنہ کی روشنی میں

تالیف:

مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری

ناشر

جمعیت المعارف الاسلامیہ

ٹیگور مارگ، نزد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر:9984778800

E-mail: jmi_lko@yahoo.co.in

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

طبع اول

محرم الحرام ۱۴۴۵ھ - اگست ۲۰۲۳ء

نام کتاب	:	مضامین سیرت ﷺ (اخلاق حسنہ کی روشنی میں)
مؤلف	:	مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری
صفحات	:	۱۴۸
کمپوزنگ	:	شفقت علی بن شوکت علی
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
طباعت	:	ورک لائن پریس، لکھنؤ
قیمت	:	۱۲۰/ایک سو بیس روپے

ناشر

جمعیت المعارف الاسلامیہ

ٹیگور مارگ، نزد دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر: 9984778800

E-mail: jmi_lko@yahoo.co.in

مضامین سیرت ﷺ

اخلاق حسنہ کی روشنی میں

نمبر شمار	عناوین	صفحہ
	مقدمہ : حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۶
	عرض حال : مولانا محمد خالد فیصل ندوی غازیپوری	۸
۱	اخلاق حسنہ کی اہمیت	۱۰
۲	انسانی زندگی کے مظاہر ثلاثہ کی اہمیت	۱۳
۳	سیرت نبویؐ کے آئینہ میں	۱۳
۴	پُر امن بقائے باہم کے لئے معاہدہ	۲۰
۵	اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں	۲۰
۶	معاہدہ کے شرائط:	۲۱
۷	نبویؐ معاہدوں کی کامیابی کا راز:	۲۲
۸	تجارتی سرگرمیاں اور اُس کے اصول وضوابط سیرت نبویؐ کی روشنی میں	۲۴
۹	حضور اکرم ﷺ بحیثیت تاجر:	۲۵
۱۰	تجارت کی فضیلت:	۲۷
۱۱	تجارتی ضوابط:	۲۷
۱۲	ذخیرہ اندوزی کی ممانعت:	۲۸
۱۳	حرمت سود:	۲۸
۱۴	ناپ تول میں کمی:	۲۹
۱۵	قسمیں کھانا:	۲۹
۱۶	کوئی آیا نہ مگر رحمت عالم بن کر	۳۰

۱۷	معاشرہ کی تربیت واصلاح اسوہ نبوی کی روشنی میں	۳۳
۱۸	دوستوں سے بھی محبت دشمنوں سے وفا بھی	۳۵
۱۹	مذکورہ بالا حدیث سے ماخوذ فوائد ونتائج:	۳۶
۲۰	کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں	۳۷
۲۱	زندگی کی شاہراہ میں اسوۂ نبوی ﷺ کی رہنمائی:	۳۷
۲۲	مسلمانوں کی کامیابی اتباع رسول ﷺ میں ہے	۳۹
۲۳	نسلی تفاخر وامتیاز اور اسوۂ رسول اکرم ﷺ	۴۱
۲۴	بعثت نبوی کا مقصد:	۴۱
۲۵	صحابہ کرام کی محبت:	۴۳
۲۶	نومولود بچے کی ولادت اور سنت نبویؐ	۴۴
۲۷	رحمت عالم ﷺ	۴۶
۲۸	درج بالا قصہ سے اخذ کردہ مسائل وفوائد	۴۷
۲۹	روشنی بخش دی زمانہ کو	۴۸
۳۰	سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے:	۴۸
۳۱	سید الاولین والآخرین کے امتیازات عالمی تناظر میں	۵۲
۳۲	تذکرہ رسول عربی ﷺ ویدوں اور پرانوں میں	۵۵
۳۳	نام کی تعیین:	۵۸
۳۴	بشارات:	۵۸
۳۶	ایمانی کردار کے آبگینے	۶۱
۳۷	اچھے ناموں کے اثرات سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں	۶۳
۳۸	اور ایک نسخہ کیمیا ساتھ لایا	۶۷
۳۹	زبان کی حفاظت لازم ہے	۷۱

۴۰	الوالعزمی کی ایک مثال	۷۳
۴۱	کلام رسول ادبی بلاغت کا شاہ کار	۷۶
۴۲	نبی کریم ﷺ کی معاشرتی زندگی	۸۲
۴۳	سیرت نبوی میں اعتدال وتوازن	۹۲
۴۴	رسول پاک ﷺ کی انسانیت نوازی اور رحمۃ للعالمینی	۹۵
۴۵	سیرت رسول کی عصری افادیت	۱۰۰
۴۶	تیسرا واقعہ سفر طائف کا ہے:	۱۰۵
۴۷	عالمی نظام اور سیرت نبوی	۱۰۸
۴۸	نیو ورلڈ آرڈر:	۱۰۹
۴۹	نئے عالمی نظام کے عناصر ترکیبیہ:	۱۱۰
۵۰	وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ	۱۱۱
۵۱	محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم دنیائے انسانیت کیلئے مکمل مثالی عملی نمونہ	۱۱۸
۵۲	سیرت کا مطلوبہ نوجوان	۱۲۷
۵۳	بعثت نبوی کا مقصد	۱۳۵
۵۴	امانت کی حقیقت قرآن وحدیث کی روشنی میں	۱۳۹
۵۵	امانت کا لغوی مفہوم	۱۳۹
۵۶	امانت کی قسمیں	۱۴۰
۵۷	امانت ایمان کا حصہ	۱۴۲
۵۸	معاشرہ میں امانت کی ناقدری	۱۴۳
۵۹	شریعت کی نظر میں امانت کا دائرہ وسیع ہے	۱۴۴
۶۰	جس میں امانت نہیں اس کا کوئی دین نہیں	۱۴۵

☆☆☆☆☆

مقدمہ

باسمه تعالی

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء وامام المرسلين محمد وعلى آله و صحبه أجمعين ، ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين ، أما بعد :

سیرت نبوی رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال اور معمولات کا نام ہے، سیرت کے معنی ہیں: عمل، طریقہ، روش، طرز وغیرہ، انبیاء کا طرز عمل، اور طریقہ زندگی تو بہت مثالی ہوتا ہے، وہ قوم وملت کے لئے اسوہ اور نمونہ ہوتے ہیں، اللہ تعالی نے انسانوں کی ہدایت کے لئے جہاں ایک طرف آسمانی صحیفوں اور کتابوں کو اتارا، وہیں دوسری طرف انبیائے کرام کو بھیجا، تاکہ ان کی عملی زندگی کو دیکھ کر لوگ صحیح راستہ پر گامزن ہوسکیں، انبیاء کا کام ڈاکیہ کی طرح صرف پیغام رسانی نہیں ہے، بلکہ عملی طور پر قوموں کے درمیان زندہ نمونہ پیش کرنا ہے، اور دین تو زندہ اشخاص سے قائم ہے اور انہیں سے رہنمائی ملتی ہے، اگر صرف پیغام رسانی کا معاملہ ہوتا تو اللہ تعالی فرشتوں کو نبی بنا کر بھیج دیتا، لیکن وہ نمونہ نہیں ہوسکتے، کیونکہ ان کی جنس انسانوں کی جنس سے الگ ہے۔

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عام رسولوں سے مختلف ہے، وہ علاقائی اور ملکی نبی نہیں، بلکہ عالمی نبی ہیں، اور آپ کی رسالت بھی عالمی رسالت ہے، اس لئے آپ کی تعلیمات میں ہر فرد کا خیال رکھا گیا ہے، بڑا ہو یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب، جوان ہو یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت، ہر شخص اس سیرت میں اپنے درد کا درماں پاسکتا ہے، اسی طرح آپ ﷺ کی سیرت میں زندگی کے مختلف مراحل کے لئے تعلیمات ہیں، جو عوام وخواص سب ہی کے لئے بہت نافع ہیں، اور سیرت رسول کے حوالہ سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ سیرت محفوظ ومدون ہے، جب کہ دیگر انبیاء کرام کی سیرتیں محفوظ نہیں ہیں، سیرت نبوی کا بنیادی

مرجع قرآن ہے اور حدیث نبوی دوسرا بنیادی مرجع ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے حکم دیا ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا، اس لئے ہر مسلمان سے مطالبہ ہے کہ وہ سیرت رسول ﷺ کو بار بار پڑھے، اور اس کے مطابق زندگی گذارے۔ کیونکہ تعمیر سیرت و کردار سازی کا مؤثر ذریعہ سیرت رسول ﷺ ہی ہے۔

مقام مسرت ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے استاذ حدیث جناب مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری زید مجدھم نے مضامین سیرت (اخلاق حسنہ کی روشنی میں) کے نام سے ایک مفید کتاب لکھی ہے، یہ کتاب رسول اللہ ﷺ کے عظیم تر اخلاقی پہلو پر محیط ہے، اور اس میں اس موضوع پر بیش قیمت مواد جمع کیا گیا ہے، مضامین سہل اور چھوٹے چھوٹے ہیں، دو تین منٹ میں پڑھنے والا ایک مضمون پڑھ سکتا ہے، اور اس کو اپنی زندگی کے لئے مفید بنا سکتا ہے، یہ کتاب عوام و خواص دونوں کے لئے نافع ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری کی اس کاوش کو قبول فرمائے، ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جو اہل علم میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئیں، ان شاء اللہ یہ کتاب بھی پسند کی جائے گی۔

راقم الحروف

سعید الرحمن اعظمی ندوی

مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۶ رصفر ۱۴۴۵ھ

۲۴ راگست ۲۰۲۳ء

عرض حال

سیرت کا موضوع انسانی زندگی کی تشکیل ہے، انسانی زندگی اپنے تمام تر محاسن میں اسی وقت جلوہ گر ہو سکتی ہے جب وہ سیرت رسول کے آئینہ میں مشاطگی کا فریضہ انجام دے رہی ہو، اگر ایسا نہیں ہے تو وہ زندگی، درندگی کا شعار بن جاتی ہے اس لئے ہر چیز نمونہ کی بنیاد پر پروان چڑھتی ہے اس کے سامنے کوئی آئیڈیل ہوتا ہے، جس کو سامنے رکھ کر اس کی اتباع کی جاتی ہے، جیسے کوئی کمپنی جب اپنے پروڈکس کو کسی دوسری کمپنی سے بنوانا چاہتی ہے، تو وہ نمونہ دیتی ہے اسی نمونہ کے مطابق وہ چیز مطلوب ہوتی ہے۔ اگر ذرا بھی فرق ہوتا ہے تو اسے رد کر دیتی ہے اور وہ مال اس لائق نہیں ہوتا کہ وہ کمپنی کے شوروم میں سجا کر رکھا جائے۔

یہی حال انسانی اعمال کا بھی ہے خواہ عبادت ہوں معاملات ہوں، معاشرت کے مسائل ہوں یا اخلاقیات کی نیرنگیاں ہوں یا سیاسیات کا میدان ہو ہر شعبہ زندگی میں نمونہ ضروری ہے، اب سوال یہ تھا کہ کس کو اور کس کی زندگی کو نمونہ حیات بنایا جائے وہ ذات جس نے کائنات کو پیدا کیا اور ہر قسم کی زندگیاں اس میں رکھی ہیں، ان میں انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے تو اس اشرفیت پر باقی رکھنے کے لئے کائنات میں سب سے اشرف ذات جو ہو سکتی تھی اس کو نمونہ بنایا جا سکتا تھا، لہٰذا اس ذات حق نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سارے جہاں کے لئے نمونہ بنایا ہے جو آپ کی زندگی اور اسوۂ کے مطابق زندگی کے خدوخال کو درست کرے گا اور اس کے مطابق زندگی گزارے گا وہ انشاء اللہ کامیاب ہوگا ،اسی لئے اللہ رب العزت نے فرمایا'' لقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة'' تمہارے لئے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین زندگی گزارنے کا اسوہ ہے، اسی اسوہ کے مطابق زندگی گزاری جائے تو کامیابی ملے گی۔

اس کے لئے تین شرطیں رکھی گئیں ہیں۔

(۱) زندگی پر عمل میں اللہ کی رضا کی امید کے ساتھ اس پر عمل کیا جائے

(۲) اور آخرت میں اس کا بدل اور اجر وثواب کو پیش نظر رکھے

(۳) ہر عمل میں اللہ کو کثرت سے یاد رکھے بلکہ اس کی ابتداء بھی اسی کے نام سے کرے

اس طرح ساری سرگرمیاں ان شاء اللہ اللہ کے حضور میں قابل قبول ہوں گی، اس کے لئے علم کی ضرورت ہے معلومات بہم پہنچانے کی ضرورت ہے، اس لئے یہ مجموعہ جس کے مضامین سیرت کے بہت سے پہلو سے جڑے ہوئے ہیں اور تعمیر حیات اور دیگر پرچوں میں شائع ہوتے رہے ہیں ان کو اور اس کے علاوہ کچھ دیگر مفید مضامین کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے، اس طرح یہ مجموعہ سیرت مفید مضامین پر مشتمل آئینہ سیرت کے مرادف ہوگیا ہے، لہٰذا ان مضامین کو کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس مجموعہ کے لئے حضرۃ الاستاذ مولانا ڈاکٹر سعید الاعظمی ندوی دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے مفید مقدمہ رقم فرمایا ہے اور اپنی مصروفیات کے باوجود آپ نے مقدمہ تحریر فرما کر ہمت افزائی فرمائی ہے، اور حوصلہ دیا، اور اس تحریر کے ذریعہ مزید مہمیز کیا ہے، ہم حضرت کے سراپا سپاس ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے برکات کو عام فرمائے آمین۔

اسی طرح جناب محمد کلام الدین ندوی صاحب نے کتاب کو دیدہ زیب طباعت کے مرحلہ سے گزارنے میں ہمارا تعاون کیا اور اس کی خوب شانہ کشی بھی کی ہے، لہٰذا ان کے بھی مشکور ہیں۔

امید کہ یہ مجموعہ خاصہ کی چیز ہوگی اور سیرت کے موضوع پر مختلف شعبہائے زندگی کو منور کرنے کا ذریعہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ مقبولیت سے نوازے، آمین۔

محمد خالد ندوی غازی پوری
عمید کلیۃ الدعوۃ والاعلام
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۱۰ ستمبر ۲۰۲۳ء

اخلاق حسنہ کی اہمیت

اسلامی تعلیمات میں اخلاق کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اخلاق انسانی زندگی کا روشن کردار اور پاکیزہ سیرت کا آئینہ دار ہوتا ہے، انسان وحیوان کے درمیان جو چیز حد فاصل ہے، جوانسان کوحیوان سے ممتاز بناتی ہے، وہ اخلاق ہی ہے، اخلاق ایک ایسی صفت ہے جوانسانی صفات کا احاطہ کرتی ہے، بلکہ انسانی اکتسابات میں رنگ ونکہت اخلاق کے ذریعہ ہی پیدا ہوتا ہے۔

اخلاق کا مطلب ہے عادات واطوار اور میل جول کے طور طریقے، اگر کسی کے عادات واطواور اور میل جول کے طریقے اچھے ہیں تو وہ اخلاق حسنہ سے متصف ہے اور اگر میل جول کے طریقے غلط ہیں اور اطوار وعادات میں برائی کا عنصر پایا گیا تو اُسے بداخلاقی سے تعبیر کیا جائے گا اور اسے اخلاق سیئہ کہیں گے۔

معاشرہ انسانی میں اگر اچھے اخلاق کے حاملین موجود ہوں تو وہ معاشرہ امن و امان، اخوت ومحبت، چین وسکون، اور جذبہ بہی خواہی، مروت ووفاکشی کا مظہر ہوتا ہے، اور اگر سماج میں بداخلاق و بدکردار لوگ پائے جائیں تو معاشرہ گھناؤنا، گھٹیا اور انتشار واضطراب کا شکار ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی جس وقت بعثت ہوئی اس وقت معاشرہ میں بداخلاقی، اور بدکرداری کا تسلط تھا، انسانی زندگی کا آوا بگڑ چکا تھا، اور انسانیت لب دم آخری سانس لے رہی تھی، آپ کی آمد ناز کی برکت سے انسانیت کو زندگی کا سلیقہ ملا، بداخلاقی کی جگہ خوش اخلاقی نے لیا، لوگ برائی کو برائی باور کرنے لگے، اچھائیوں اور اچھی صفات کو فروغ ملا، آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی بداخلاقی کے فساد اور انارکی کو دور کر کے اس کو نیکیوں پر

استوار کرنا تھا: "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ" (اچھے اخلاق کی تکمیل کرنا میری بعثت کا مقصد ہے۔)

رسول کریم ﷺ نے ہمیں اخلاق حسنہ کی تعلیم دی ہے، آپ خود بھی اخلاق حسنہ کا مکمل ترین نمونہ تھے، اور آپ نے لوگوں کو بھی یہی تاکید فرمائی ہے کہ ہر معاملہ میں اخلاق حسنہ کو اپنایا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات عالیہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے حضرت حسینؓ نے فرمایا: 'آپ نرم خو اور شفیق تھے، رافت و مہربانی آپ کا امتیازی وصف تھا، سخت مزاجی اور تنگ دلی سے آپ کو نفرت تھی، کوئی بری بات زبان سے نہ نکالتے تھے کسی معاملہ میں شور و ہنگامہ نہیں کرتے تھے کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے تھے، جو بات آپ کو ناپسند ہوتی اس سے اغماض فرماتے تھے، کوئی شخص کسی چیز کی امید رکھتا اور آپ سے سوال کرتا تو اسے مایوس نہ کرتے، تین چیزوں سے آپ کنارہ کش رہے (۱) بحث و مباحثے سے (۲) ضرورت سے زیادہ باتیں کرنے سے (۳) جس معاملہ سے کوئی تعلق نہ ہو اس میں دخل انداز ہونے سے، دوسرے کی دل جوئی فرماتے اور اس کی بات نہایت غور اور توجہ سے سنتے، جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا خاموشی اختیار فرمائے رکھتے کسی کو بات بات میں ٹوکنا اور سلسلہ گفتگو آگے نہ بڑھنے دینا آپ کے مزاج کے منافی تھا۔

آپ ﷺ اچھے اخلاق پر قائم رہنے کی دعا بھی فرماتے تھے:

"وَاهْدِنِی لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَهْدِنِیْ لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّئَاتِهَا لَا یَصْرِفُ عَنِّیْ سَیِّئَاتِهَا اِلَّا اَنْتَ"

(اے میرے پروردگار تو مجھے بہترین اخلاق کی رہنمائی سے نواز، تیرے سوا کوئی بہترین اخلاق کی رہنمائی سے نہیں نواز سکتا، اے میرے پروردگار تو برے اخلاق کو مجھ سے دور فرمادے، تیرے سوا کوئی بھی برے اخلاق کو دور نہیں کر سکتا۔)

ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا" (کامل ترین ایمان مسلمانوں میں اس کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں)

" خِیَارُکُمْ اَحْسَنُکُمْ خُلُقًا" (تم میں سب سے اچھا شخص وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں)

ایک روایت میں آیا ہے:"اَحَبُّ الْعِبَادِ اِلَی اللّٰہِ اَحْسَنُھُمْ اَخْلَاقًا" (بارگاہ الٰہی میں سب سے پیارا شخص وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے ذکر کیا گیا کہ حضور ﷺ فلاں عورت بڑی نمازی، چاشت وتہجد کی پابند ہے لیکن اس کے اخلاق اچھے نہیں ہیں، پڑوسی پریشان رہتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا وہ جہنمی ہے، پھر دوسری عورت کا تذکرہ آیا کہ نماز پنج وقتہ پڑھتی ہے لیکن اخلاق اس کے بہت اچھے ہیں، اس کے پڑوسی اس سے خوش ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا وہ جنتی ہے، لہٰذا آج ہم اپنی زندگی پر غور کریں کہ ہمارے اخلاق کیسے ہیں؟ کیا ہم کسی معاملے میں اپنے آپ کو ترجیح تو نہیں دے رہے ہیں؟ درشت مزاجی، اکھڑ پن اور معاملات میں سختی کا ہم شکار تو نہیں؟ جو شخص ہماری طبیعت ومزاج سے ہم آہنگ ہو کر بات نہ کرے اسے کس حد تک برداشت کرنے کو تیار ہیں؟ مخالف کے ساتھ نرمی، شفقت ومہربانی کا سلوک روا رکھتے ہیں؟ کمزور اور غریب کو وہی حیثیت دیتے ہیں جو امیر اور طاقتور کو دیتے ہیں، یا ہم ہر معاملے میں اپنی ذات کو مقدم قرار دیتے ہیں، اور اپنے مفاد کے حصول کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچانا ہماری فطرت ثانیہ بن چکی ہے، اپنی طرف اچھائی اور دوسروں کی طرف برائی منسوب کرنا ہمارا شیوہ ہو گیا ہے، اس پر ہمیں غور کرنا چاہئے، اور اپنے اخلاق کو سنوارنے کی فکر کرنی چاہئے، اس کے بغیر ہم اتباع نبویؐ کے دعویدار اور اخلاق نبویؐ کے علمبردار نہیں ہو سکتے۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہ عشق ومستی میں وہی اول وہی آخر وہی قرآں وہیں فرقاں وہی یاسیں وہی طٰہٰ

☆☆☆

انسانی زندگی کے مظاہر ثلاثہ کی اہمیت
سیرت نبویؐ کے آئینہ میں

انسانی زندگی کے تین اہم اجزاء ہیں فکر، قول اور عمل، کائنات کی نیرنگیوں تہذیب وثقافت کی بوقلمونیوں، علم وتمدن کی کثرت سب کا سرچشمہ یہی انسانی فکر، انسانی قول اور انسانی عمل ہیں۔ انسان کو انہی خصوصیات کی وجہ سے کائنات کی سروری کے لئے منتخب کیا گیا اور اشرفیت کا تاج دیا گیا۔ انہیں کی بدولت وہ ہواؤں کو اسیر، فضاؤں کی تسخیر، پہاڑوں اور وادیوں کو زیروزبر کرتا ہے۔ دریا کا رخ موڑنے پر قادر ہے، آفتاب کی شعاؤں کو کنیز خانہ بنانے کی قدرت رکھتا ہے برق تپاں کو پابجولاں کرنا اس کے لئے آسان ہے۔ لوہا، آگ، پانی، ہوا، جنگل کے درندے اور سمندر کی تہہ میں پرورش پانے والے آبگینوں کو بھی اس کی گرفت ودسترس سے باہر نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا مظاہر ثلاثہ میں سے کوئی ایک فرد جب وجود میں آتا ہے تو وہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتا اس کا تعلق یا تو کائنات سے ہوتا ہے یا خالق کائنات سے خواہ وہ فرد فکر ہو یا قول ہو یا عمل انسان کی عظمت کے پیش نظر ان کی عظمت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور انسان جب اس کائنات کی سب سے اعلیٰ مخلوق ہے اور اللہ وحدہ لاشریک لہ نے اس کو کائنات کی نیابت وخلافت تفویض کی ہے تو اس کی فکر اس کے قول وعمل کی تنقیح وتہذیب اس کے جسمانی وجود کی تسویہ وترکیب سے کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى"

(پاکی بیان کرو اپنے بلند شان والے رب کے نام کی جس نے پیدا کیا
(انسان کو) تو درست کیا اور جس نے (اس کے جوڑ و بند میں صحیح)
اندازہ لگایا تو اسے ہدایت عطا کی۔)

ان آیتوں میں اللہ رب العزت نے ان دونوں نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے جہاں ان کے جسمانی نظام کی امتیازی شان کو ایک لفظ تسویہ درست کرنا برابر کرنا تناسب کیساتھ رکھنا سے ظاہر کیا گیا ہے وہیں اس کے فکر و قول کی تابندگی کو وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی کے آئینہ میں دیکھا گیا ہے۔ زاویہ نظر کے اختلاف کی وجہ سے کائنات میں انسان کی فعالیت کی تشریح میں اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان سب کے باوجود وہ سب کچھ نہیں ہے بلکہ اس کا کچھ ہے۔ ہر آن احتیاج کی بیڑیاں اسے اسیر کرتی رہتی ہیں توفیق و ہدایت کا وہ اس طرح محتاج ہے جس طرح وہ اپنی زندگی کی بقا کے لئے پانی اور ہوا کا ضرورت مند ہے:

"یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ۔" (سبا)

(اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تم سے مستغنی ستودہ صفات ہے۔)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کبھی احتیاج و جھمیلوں سے بھی آزاد نہیں ہو سکتی ارشاد ربانی ہے:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ۔"

(ہم نے انسان کو جھمیلوں میں پیدا کیا۔)

روش صدیقی کا شعر ہے کہ ؎

زندگی نام ہے طوفان حوادث کا روشؔ
ننگ ساحل ہے وہ جس کو کوئی طوفاں نہ ملا

لہٰذا اس کی نظر اس کا قول اس کا عمل یہ بھی آزاد ہیں، اس پر بھی ہدایت کی مہر کی

احتیاج لازم ہے، جس طرح جسمانی اعذار ہیں اسی طرح فکری عوارض ہیں، زبان کی کجی اور عملی بے اعتدالیاں ہیں، ان سے اگر انہیں پاک وصاف نہیں کیا گیا تو ان کی فعالیت متاثر ہوگی اور کائنات میں انسان کی افادیت معدوم ہو جائے گی، یہ انسانی زندگی کے فطری خواص بھی ہیں، ان کی رہنمائی اور تصقیل کا فریضہ وہی دین کرسکتا ہے جو دین فطرت ہے اور وہی نبی کرسکتا ہے جو دین فطرت کا داعی ہے وہی معبود کرسکتا ہے جو اس کا خالق بھی ہو۔ انسان اپنی زندگی کی بخیہ گری میں مثالوں کا محتاج ہے، اسوہ اور نمونہ کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتا، نہ اس کی زبان کھل سکتی ہے نہ اس کی آنکھیں حقیقت بیں ہوسکتی ہیں اس کے بغیر اس کی فکر اس کا عمل طوفان کے رخ پر تودہ ریگ سے زیادہ حیثیت کا حامل نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے انسانی فکر کو مہمیز کرنے کے لئے کوہ صفا سے آواز لگائی قریش کے میلوں میں گھوم گھوم کر برملا سمجھاتے رہے، منیٰ مزدلفہ اور عرفات تک میں آنے والے حجاج کو دین حق کی طرف بلاتے رہے، مقام سعی اور جائے طواف حطیم کعبہ اور چاہ زم زم ان میں سے کوئی سی ایسی جگہ ہے جہاں داعی رسالت نے انسانوں کو ان کی عظمت کو یاد نہ دلایا ہو اور کفر وشکر کے بطلان توہمات وخرافات کی بے حقیقتی کو واضح نہ کیا ہو کبھی ایسا بھی ہوا کہ اہل تعلق کو دعوت طعام پر بلایا اور فراغت کے بعد اسلام کی ابدی اور سرمدی دعوت یوں پیش کی:

"مَا اَعْلَمُ اِنْسَانًا فِی الْعَرَبِ جَآءَ قَوْمَهٗ بِاَفْضَلِ مَاجِئْتُكُمْ بِهٖ قَدْ جِئْتُكُمْ بِخَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَقَدْ اَمَرَنِیْ رَبِّیْ اَنْ اَدْعُوَكُمْ اِلَيْهِ فَاَيُّكُمْ يُوَازِرُنِیْ"

(اہل عرب میں آج تک کوئی شخص مجھ سے بہتر پیغام نہیں لایا، یہ پیام دنیا وعقبیٰ دونوں کی بھلائی کا رہنما ہے اس پیام میں اللہ نے مجھے بتایا ہے کہ میں آپ لوگوں کو اس کی طرف بلاؤں آپ میں کون میرا پیام قبول کرکے ساتھ دیتا ہے۔)

آپ ﷺ نے کوہ صفا سے یہ آواز لگائی:

"اَرَئَيْتُمْ لَوْ اَخْبَرْتُكُمْ اَنَّ خَيْلًا بِسَفْحِ هٰذَا الْجَبَلِ اَكُنْتُمْ

تُصَدِّقُوْنِیْ۔"

(اے قریش اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے عقب میں ایک لشکر جرار ہے تو کیا تم میری بات کی تصدیق کروگے؟)

قریش نے جواب دیا:

"نَعَمْ اَنْتَ عِنْدَنَا خَیْرٌ مِّنْھُمْ وَمَا جَرَّبْنَا عَلَیْكَ كَذِبًا قَطُّ"

(ہاں! بیشک آپ ہم میں سب سے بہتر ہیں اور ہم آپ کی بات کو صحیح تسلیم کریں گے۔آپ نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔)

پھر فرمایا:

"فَاِنِّیْ نَذِیْرٌلَّكُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ۔ یَا بَنِیْ عَبْدِالْمُطَّلِبِ، یَا بَنِیْ عَبْدِ مُنَافٍ، یَا بَنِیْ زُھْرَةَ، یَا بَنِیْ تَمِیْمٍ، یَا بَنِیْ اَسَدٍ اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَنِیْ اَنْ اُنْذِرَ عَشِیْرَتِیْ الْاَقْرَبِیْنَ وَاِنِّیْ لَا اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ الدُّنْیَا مَنْفَعَةً وَالْاَمْنَ فِی الْآخِرَةِ نَصِیْبًا اِلَّا أَنْ تَقُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہِ۔"

(لوگو تم پر عذاب نازل ہونے سے پہلے میں تمہیں محفوظ رکھنا چاہتا ہوں، اے بنو عبدالمطلب، اے خاندان عبد مناف، ابنائے زہرہ، اے اولاد تمیم، اے قبیلہ مخزوم، اے فرزندان اسد سب حضرات غور سے سنیں کہ اللہ نے مجھے اپنے جدی قرابت داروں کو عذاب سے متنبہ کرنے کا حکم دیا ہے اگر آپ لوگوں نے خدائے وحدہ لاشریک لہ کی پرستش نہ کی تو میری قرابت داری دنیا و عقبیٰ میں کچھ کام نہ آسکے گی۔)

اس طرح حضور اکرم ﷺ نے انسانی فکر کو جو پابجولاں تھی آزادی بخشی اس کے لئے آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے اصحاب نے وہ ایثار و قربانی کا نمونہ پیش کیا جس کا تصور بھی آسان نہیں ہے، اس لئے کہ انسان عظیم تھا، اس کی فکر عظیم تھی، وہ انسانوں کو یعنی عظمتوں کو پامال کرتے ہوئے دیکھ کر کڑھتے تھے تڑپتے تھے اور ہر طرح کی قربانی پیش

کرتے تھے۔

فکر کا سرچشمہ دل و دماغ کو قرار دیا جاتا ہے تمام اعضاء و جوارح پر دماغ کی حکمرانی ہے لیکن دماغ پر حکمرانی دل کی ہے اور دل و دماغ کے حسن امتزاج سے اعلیٰ فکر کا وجود ہوتا ہے، حضور اکرم ﷺ قرآن پاک کی آیتیں پڑھ پڑھ کر اہل فکر و دانش کو متوجہ کرتے رہے، کائنات کی عظیم نشانیوں کا تذکرہ کر کے غور و فکر کی دعوت دی جاتی رہی۔ "وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا" (اور اگر قرآن پاک کا نزول اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سارا اختلاف پاتے۔) "اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا" (تو کیا قرآن پاک میں فکر و تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔) انسانی وجود میں دل کی اہمیت کو حضور اکرم ﷺ نے یوں بیان فرمایا: "اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ" (بخاری) (سن لو بے شک جسم انسان میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے جب وہ صالح صحت مند ہوتا ہے تو سارا جسم صحت مند ہوتا ہے اور جب اس میں فساد اور بگاڑ آجاتا ہے تو سارا جسم اس کا شکار ہو جاتا ہے سن لو وہ دل ہے۔) دل و دماغ کو اللہ تعالیٰ نے جسم انسانی پر حکمرانی عطا کی ہے ان کے صلاح و فساد سے دیگر اعضا بالفعل متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اس کی طرف خصوصی توجہ فرمائی صحابۂ کرام کا عالم یہ تھا کہ اگر ان سے کوئی چوک ہو جاتی تو جب تک انہیں یہ یقین نہ ہو جاتا کہ اس گناہ سے وہ پاک ہو گئے ہیں ان کی بیقراری کو قرار نہ آتا۔ دین کی عظمت اُن کے دل و دماغ میں اس طرح بیٹھ گئی تھی کہ مال و دولت کی عظمت اس کے سامنے ہیچ تھی آپ ﷺ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص آپ ﷺ کا گرویدہ تھا آپ ﷺ کے علم و عمل کا براہ راست داعی بن چکا تھا۔ فکر کو جلا حاصل ہونے کے بعد قول و عمل میں اس کی تنویر خود بخود ظاہر ہونے لگتی ہے۔ قول و عمل کے تعلق سے ارشاد ہوا:

"يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ"

(اے ایمان والو کیوں تم وہ کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو باعث غضب
ہے اللہ کے نزدیک یہ بات کہ تم کہو وہ جو کرتے نہیں ہو۔)

ایک موقع پر حضرت عقبہ ابن عامر نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ حضور ﷺ نجات کی سبیل کیا ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اَمْلِكْ عَلَى لِسَانَكَ" (اپنی زبان پر قابو رکھو۔) حدیث میں یہ بھی وارد ہے اعضاء جسمانی ہر صبح زبان کی خدمت میں عرض گزار ہوتے ہیں کہ خدا کے لئے تم صحیح رہنا کج نہ ہونا تو ہم سب صحیح راہ مستقیم پر گامزن رہیں گے۔ یہی زبان ہے جس سے انسان پھول بھی برساتا ہے اور کانٹے بھی بکھیرتا ہے، اللہ نے زبان میں ایسی تاثیر دی ہے کہ اس کے لفظ سے سمندر کے برابر پانی تلخ و کڑوا ہو جائے اور اس کا ایک بول وجود انسانی میں ایسا رس گھول دے کہ ہر بن مو سے شیرینی ٹپکتی ہوئی محسوس ہو، لیکن زبان اسی فکر کی پابند ہے جو ذہن انسانی قلب انسانی کی تحریک پر وجود میں لاتا ہے وہ اصیل ہے تو یہ بھی اصیل ہے عمل میں نور فکری تنویر کے بغیر ممکن نہیں اس لئے فرمایا گیا ہے:

"اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ
الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا۔"

(جو لوگ ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے ان کے لئے فردوس بریں
میں مہمانی ہے)

حضور ﷺ نے جہاں زبان کو لغویات، خرافات، افترآت، کذبیات سے پاک رکھنے کا حکم دیا وہیں حسن و عمل کی تلقین کی۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا۔

قرآن بھی شاہد ہے خدا حسن سے خوش ہے
کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسن عمل سے

حسن عمل کے بغیر انسان کی زندگی ایک پلید ہے۔ ابنائے جنس ہی پر وہ بار نہیں بلکہ فضائے بسیط میں اس کا وجود تعفن کی آماجگاہ بن جاتا ہے حسن قول کے ساتھ حسن عمل کی تاکیدیوں بھی کی گئی ہے:

"وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ

اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ"

(اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور اچھا عمل کرے اور کہتا رہے میں تو مسلمان ہوں۔)

مسلمان قول و عمل کا دھنی ہوتا ہے اس کی زبان نہ ہرزہ سرائی یا وہ گوئی سے آلودہ ہوتی ہے اور نہ ہی عمل کے میدان میں اس کے پاؤں کو لغزش ہوتی ہے۔ وہ داعی ہے۔ فکر و عمل و قول کے حسین امتزاج کے ساتھ اس کا کارواں آگے بڑھتا ہے۔ حسن عمل کی دولت جسے نصیب ہو جائے تو دنیا اور آخرت کی کامیابیاں مل گئیں لیکن حسن عمل حسن عمل اس وقت ہے جب اس میں دو شرطیں پائی جائیں۔ وہ عمل خالص لوجہ اللہ ہو، نیت میں کوئی کھوٹ نہ ہو، ورنہ بڑے سے بڑے عمل کی اللہ کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔ دوسرے وہ عمل سنت رسول ﷺ کے مطابق ہو۔ اگر کوئی عمل نیت خالصہ کے ساتھ کیا جائے لیکن وہ حضور ﷺ کے طریقہ کے مطابق یا آپ ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں نہ ہو تو اس عمل کی کوئی حیثیت نہیں۔ نماز کوئی تمام شرائط کے ساتھ ادا کرے لیکن نیت ریا و دکھاوے کی ہے تب بھی غلط اور اگر خشوع و خضوع اور خلوص نیت کیساتھ تو ہے لیکن طہارت کا اہتمام نہیں یا قبلہ کی طرف رخ نہیں یا تعداد رکعت میں اضافہ یا کمی کے ساتھ پڑھی گئی تو وہ نماز بھی رد کر دی جائے گی۔ اسی طرح ہر کام، ہر قول اور ہر فکر پر یہ چیز صادق آتی ہے۔

حضور ﷺ کی سیرت کے آئینہ میں ہمیں اپنے ان مظاہر ثلاثہ کو بغور دیکھنا چاہئے۔ آیا ان پر کوئی داغ و دھبہ تو نہیں لگ رہا ہے، دنیا بھر میں ہم مسلمان حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے بڑے بڑے جلسے، سیمینار، کوئز وغیرہ کرتے ہیں اگر وہ اس فکر و روح سے خالی ہیں تو ان کی حیثیتِ دینی مجروح ہو جائیگی اور کل کہیں اپنے اعمال کا حساب ہمارے لیے پابہ زنجیر ثابت نہ ہو۔

اَللّٰھُمَ ارْزُقْنَا اتِّبَاعَ حَبِیْبِكَ مُحَمَّدٍ ﷺ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی۔

☆☆☆

پُرامن بقائے باہم کے لئے معاہدہ
اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں

اسلام امن کا داعی اور محرک ہے، حضور اکرم ﷺ کے ذریعہ دنیا کو جو سب سے بڑا تحفہ ملا وہ انسانیت کی قدر و قیمت کا حقیقی شعور ہے، آپؐ کے مثالی کردار نے باہمی زندگی کو نفرت، حسد، عداوت اور باہمی لڑائی جھگڑوں کے دلدل سے نکال کر محبت، الفت، رواداری، مروت، سیر چشمی اور بلند کرداری کی چوٹی پر پہنچا دیا، آپؐ نے پرامن بقائے باہم کا موثر درس دیا، وہ قوم جس کی زندگی عناد سے عبارت تھی، جس کا طرۂ امتیاز کبر و نخوت و پندار کو ہر ممکن طریقے سے فروغ دینا تھا، دوسرے کی تذلیل و توہین جس کا قومی مزاج تھا، اس قوم کی زندگی کے متعلق نقطہ نگاہ کو آپؐ نے حکمت و بصیرت کے ساتھ یکسر بدل دیا، لہٰذا ان کی اخلاقی زندگی میں انتقام کے بجائے عفو و کرم، غرور نفس کی جگہ عجز و انکساری، قتل و غارت کی جگہ امن و آشتی اور خدمت خلق زندگی کی بلند قدریں شمار ہونے لگیں اور ایک خدا کی بندگی اور آخرت کی جوابدہی کے گہرے شعور نے ان کی زندگی کو وہ معنویت عطا کی کہ وہ اپنے پندار کے صنم کدہ کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی طرف آ رہے ہیں، وہ جنگجو اور باہم متحارب قبائل کی سطح سے بلند ہو کر ایک قوم و ملت اور جماعت بن گئے ہیں، وہ قوم باہمی رنجشوں کو دور کر کے محبت آشنا ہو گئی، ہمدردی، بہی خواہی ان کا شعار بن گیا، اس عظیم تبدیلی کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پرامن بقائے باہم کی سوغات عام کرنے کے لئے جنگ جویانہ روش رکھنے والے قبائل سے معاہدے کئے تا کہ بقائے باہم کی معنویت اجاگر ہو سکے، بقائے امن کے

متعلق آپ کی حکیمانہ سیاست کا انداز اس امر سے لگائیے کہ جب ۸ھ میں آپ مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو آپؐ کے سامنے وہ لوگ آئے جنہوں نے آپؐ اور آپؐ کے جانثار ساتھیوں کو برابر تیرہ سال تک ستایا تھا لیکن جب وہ آپؐ کے سامنے لائے گئے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں تم سے وہی سلوک کرنے والا ہوں، جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے فرمایا:

''کہ آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں ہے، اللہ تمہارا قصور معاف فرمائے وہ تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جاؤ تم سب لوگ آزاد ہو۔''

معاہدہ کے شرائط:

نجران یمن کی سبز پوش پہاڑیوں سے گھرا ہوا زرخیز علاقہ جہاں عیسائیوں کی غالب آبادی تھی، مدینہ منورہ میں ان کا وفد آیا تو آپؐ نے ان کا استقبال کیا اور اسلام کو سمجھنے کا موقعہ دیا، نہ ان پر کوئی دباؤ ڈالا اور نہ ہی کوئی دھمکی دی بلکہ ان کی خواہش کے مطابق وہ معاہدہ کیا جس میں یہ دفعات شامل تھیں۔

(۱) ہرگز ہرگز ان (عیسائیوں) کو رسوا نہیں کیا جائے گا۔

(۲) انہیں فوجی خدمات انجام دینے کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(۳) ان پر صرف عدل وانصاف کی حکمرانی ہوگی۔

(۴) ان کے مال و دولت، ان کے مذہب اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے گی۔

قرآن مجید کی تعلیمات اور رسول کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ نے اس بات کو واضح کر دیا کہ جنگ وخونریزی سے بچنے کے لئے مسلمان دوسری قوموں سے امن کا معاہدہ کر سکتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ انسان کو پر امن بقائے باہم کا پہلا قانون اور مؤثر درس رسول کریم ﷺ نے دیا ہے، یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ مسلم اور غیر مسلم کے باہمی

تعلقات بنیادی طور پر جنگ پر نہیں امن پر مبنی ہیں، جنگ صرف ایک عارضی صورت ہے جسے صرف اس وقت روا رکھا گیا ہے جب مسلمان جارحیت کا شکار بن جائیں، یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد ابن حنبل نیز دوسرے فقہا کے نزدیک اسلام کے یہاں جنگ کا سبب کفر یا اسلام کا انکار نہیں بلکہ جارحیت ہے، دوسرے یہ کہ جنگ کا مقصد جارحیت وفتنہ وفساد کو روکنا ہے، تیسرے یہ کہ مسلمان دوسرے امن پسند قوموں کے ساتھ امن کا معاہدے کر سکتے ہیں، لیکن معاہدہ انصاف، اخوت اور اخلاقی اصولوں پر ہونا چاہئے، یہی وجہ ہے کہ یہ معاہدے کامیاب رہے اور عام لوگ خوف وہراس کے بجائے امن وسکون کی فضاء میں زندگی بسر کرنے لگے اضطرار اور بدامنی کا دور جو تقریباً فتح مکہ تک جاری رہا اپنے اختتام کو پہنچا، حجاز میں بدامنی کا عالم یہ تھا کہ آدمی مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تک سفر کرتے ہوئے ڈرتا تھا، خانہ کعبہ کے علاوہ ہر جگہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا خطرہ موجود تھا قرآن پاک میں ارشاد ہے ہم نے ان کے لئے حرم کو دارالامن بنایا اس کے باہر بدامنی کا یہ عالم ہے کہ حرم کے چاروں طرف سے آدمی اچک لئے جاتے تھے (عنکبوت) لیکن رسول اللہ ﷺ کی حکیمانہ اور دوررس سیاست (تدابیر امور) سعی پیہم سے پھر وہ وقت آیا کہ آپ کی پیشن گوئی پوری ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا تھا ایک وقت آئے گا جب صنعاء یمن سے ایک محمل نشین خاتون تنہا سفر کرے گی اور خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔

نبویؐ معاہدوں کی کامیابی کا راز:

چنانچہ ایسا زمانہ آیا، ان نبویؐ معاہدوں کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ ان میں اخلاقی روح کام کر رہی تھی، اور زندگی کے بارے میں رسول کریم ﷺ نے انسان کے نقطۂ نظر کو بدل دیا تھا، لیکن ان معاہدوں کے برعکس جب کبھی تاریخ میں فاتح قوموں نے خوف خدا اور اخلاقی قدروں سے بے نیاز ہو کر مفتوح قوموں کو اپنے ظالمانہ معاہدوں کا پابند بنایا تو وہ ایک دوسری خوفناک جنگ کا موجب بنے۔

صلح حدیبیہ میں حضور اکرم ﷺ نے اپنے سب سے بڑے دشمن سے وہ تاریخی

معاہدہ کیا جسے قرآن پاک نے فتح مبین قرار دیا ہے، رسول اکرم ﷺ کے پیغمبرانہ کردار کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے سویڈن کے معروف مستشرق ٹوراندرے (Tor Andree) لکھتے ہیں:

''ضبط نفس جس کا مظاہرہ حضرت محمد ﷺ نے حدیبیہ میں کیا ایسے ہی ایک بلند نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے غیر ضروری امور پر ذاتی توہین کو برداشت کرنے کا حوصلہ اور ہمت یہ صفات بتاتی ہیں کہ آپ بے مثال اور منفرد اہمیت کے حامل تھے، واقعہ یہ ہے کہ آپ کی سی ذہنی برتری رکھنے والا انسان زمام کار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے خواہ اسے کبھی لمحہ بھر کے لئے مجبوراً جھکنا ہی کیوں نہ پڑے۔''

مسلمانوں میں اخوت و بھائی چارگی کے رشتوں کو مستحکم کرنے اور بدامنی و خونریزی کو روکنے کے لئے رسول اللہ نے جو معاہدے مرتب کئے وہ تاریخ کے ایسے انوکھے معاہدے ہیں جن میں سیاست اور اخلاق دونوں ساتھ چلتے ہیں ان سے امن و آشتی کے لئے کام کرنے والوں کو ہمیشہ نیا عزم و حوصلہ ملتا رہے گا۔

☆☆☆

تجارتی سرگرمیاں اور اُس کے اصول وضوابط سیرت نبویؐ کی روشنی میں

تجارت ایک معزز پیشہ ہے جس سے صارفین کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، ہر دور کے معززین نے اس پیشہ کو اختیار کیا ہے، قبل از اسلام بعض انبیاء علیہم السلام بھی تجارت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں تو ایکسپورٹ، امپورٹ کا کاروبار بہت مستحکم تھا، اس کے لئے بحری بیڑے تیار کئے گئے تھے، محافظین کا مخصوص دستہ بھی ہوتا تھا جو تجارتی سامانوں اور تاجروں کے تحفظ پر مامور ہوتا تھا، بیرونی تجارت کے لئے دور دراز کے علاقوں میں تجارتی ایجنٹ بھی مقرر کئے جاتے تھے، بحیرہ روم وخلیج فارس میں مشہور تجارتی بندرگاہیں قائم تھیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام خاص طور پر ایسی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے جس کا آبائی پیشہ سوداگری تھا، تجارت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، ذہنی کجی، فکری الحاد اور ضلالت وگمرہی اور مادی زندگی میں باہم مسابقت نے انہیں استحصال کی نئی نئی راہوں پر ڈال رکھا تھا، ناپ تول میں اس طرح کمی بیشی کرتے کہ دیکھنے والے کو شبہ بھی نہ ہوسکتا تھا، تطفیف یعنی ناپ تول میں کمی کو جائز ہی نہیں بلکہ ہاتھ کی صفائی آرٹ اور ماہرانہ فن باور کرتے تھے۔

اہل عرب خصوصاً قریش مکہ کا ہر فرد تاجر تھا ان کی تجارت بھی ملک شام اور یمن تک پھیلی ہوئی تھی، اس کا دائرہ مصر، ہندوستان اور ایران نیز وسط ایشیا کے دیگر ممالک تک پہنچا ہوا تھا، قرآن پاک میں قریش کے موسم سرما اور گرما کے تجارتی سفروں کا تذکرہ موجود ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

"لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ اِيْلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ، فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ، الَّذِیْ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ آمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ۔"
(چونکہ قریش خوگر ہوتے ہیں یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے لہٰذا (اس نعمت کے شکریہ میں) ان کو چاہئے کہ اس خانہ کعبہ کے مالک کی عبادت کریں جس نے اُن کو بھوک میں کھانے کو دیا اور خوف میں انہیں امن عطا کیا۔)

عربوں کے تجارتی قافلے بحرین براعظم افریقہ (مصر وسوڈان) ایران اور دنیا کے دیگر ممالک کی طرف جاتے تھے، عربوں کے تجارتی قافلے جب بیرونی ممالک جاتے تو اُن کے ہمراہ محافظین کے ساتھ دلیل وگائیڈ بھی ہوتے تھے جو نازک موقعوں اور معاملے میں اُن کی رہنمائی کرتے تھے، تجارتی مواصلات میں اونٹ کو اہمیت حاصل تھی، وہ صحرا کا جہاز تھا، جس کے ذریعہ تجارتی مال منگوایا جاتا اور دیگر ممالک میں بھجوایا بھی جاتا تھا، مکہ مکرمہ میں عکاظ کا میلہ لگتا تھا، یہ ایک تجارتی میلہ تھا، ۱۲۹ھ تک یہ میلہ لگتا رہا، اس دور کی مشہور تجارتی منڈیاں مندرجہ ذیل تھیں، مثلاً دومۃ الجندل، ہجر، صحار، ریا، شجر، عدن، صنعاء، رابیہ، حضرموت، عکاظ، ذوالمجاز، بصری وغیرہ۔

مندرجہ ذیل ممالک سے ذیل اشیاء منگوائی جاتی تھیں۔ یمن سے ریشم، عدن سے قیمتی کپڑا، جنوبی یمن سے خوشبوئیں، گرم مصالحہ جات، جڑی بوٹیاں، دیگر قیمتی اشیاء، ہند وافریقہ سے عطریات، خوشبوئیں، گرم مصالحہ جات، ہاتھی دانت وغیرہ، شام سے سامان تعیش، اناج اور تیل، مصر سے متفرق اشیاء، روم سے ریشم، روئی مخمل اور نفیس کپڑے۔

حضور اکرم ﷺ بحیثیت تاجر:

حضور ﷺ نے جس زمانہ میں آنکھ کھولی چاروں طرف مادیت کا غلبہ تھا، تجارت زوروں پر تھی، اس کی سرگرمیاں شباب پر تھیں، حضور اکرم ﷺ کے والد ماجد حضرت عبداللہ خود بھی تاجر تھے، اور جس وقت ان کا انتقال ہوا اس وقت شام کی طرف تجارت ہی

کی غرض سے گئے ہوئے تھے، حضور ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کے ہمراہ بیرونی تجارتی اسفار پر بھی گئے۔ اور جب عمر شریف بیس سے اوپر ہوئی تو تجارتی اسفار بطور شرکت مضاربت کے آپ ﷺ نے کئے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ کی سرمایہ دار خاتون تھیں، ان کا مال لے کر آپ نے شام کا سفر کیا، اور تجارتی سوجھ بوجھ اور امانت و دیانت کی وجہ سے اس تجارت میں خوب فائدہ بھی ہوا، جس سے متاثر ہو کر حضرت خدیجہ الکبری نے اپنی سہیلی حضرت نفیسہ کو نکاح کا پیغام دے کر بھیجا اور آپ نے قبول فرمایا، اس وقت آپ کی عمر شریف پچیس سال تھی اور حضرت خدیجہ الکبری کی عمر چالیس سال تھی، حضرت خدیجہ الکبری کے کاروبار کو حضور ﷺ نے باحسن وجوہ سنبھالا ہی نہیں بلکہ فروغ دیا، یہاں تک کہ آپ کو سارے جہاں کے انسانوں کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا گیا۔

حضور ﷺ کے معتمد علیہ اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق بھی اچھے تاجر تھے، کپڑوں کی تجارت کرتے تھے، حضرت عمرؓ کی تجارت ایران سے تھی، اور حضرت عثمانؓ کا کاروبار تھوک کا تھا، اشیاء خوردنی ان کا خاص کاروبار تھا، مصر سے غلہ منگایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت میں بڑی برکت دی تھی، ایک دفعہ قحط پڑا تو حضور ﷺ کے حکم پر ہزاروں من غلہ قحط رسیدہ لوگوں میں تقسیم کرایا اور بئر رومہ کو ۳۵ ہزار درہم میں خرید کر کے مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف ایک کامیاب تاجر تھے، اپنی تجارت کا معتدبہ حصہ تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر رکھا تھا۔

مسلمانوں کی تجارتی دلچسپیاں روز بروز بڑھتی گئیں، یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری میں ابوالقاسم ابن خرداذبہ نے بحری اور بری تجارت کے لئے راستوں کا تعین کیا اور تجار کے لئے دلیل المسافرین کتاب تیار کی، مسلمان تجارت کے لئے جہاں بھی گئے، اپنی دیانت، امانت، مروت اور اخلاق فاضلہ کے بموجب وہاں کی پوری سوسائٹی پر چھا گئے، وہ پہلے داعی تھے، بعد میں تاجر، اس کا اثر یہ ہوا کہ جہاں انہوں نے تجارتی کامپلیکس بنوائے وہاں دین کی اشاعت کے لئے مراکز بھی قائم کیے، اور ان کی جدوجہد سے پورا پورا علاقہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا، جنوبی ہند کا بیشتر حصہ، مالدیپ لکش دیپ کے جزائر، انڈونیشیا، ملیشیا

میں اسلام انہیں باکردار تاجروں کا رہین منت ہے۔ایک بزرگ صحابی حضرت وہبؓ ابن ابی کبشہ چین کے بادشاہ کے پاس بطور سفیر گئے اور وہیں رحلت فرمائی، پروفیسر آرنلڈ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب دی پریچنگ آف اسلام میں لکھا ہے کہ: 'اسلام تجارت کے ذریعہ اور تبلیغ کے ذریعہ پھیلا نہ کہ تلوار کے ذریعہ۔'

تجارت کی فضیلت:

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "عَلَیْکُمْ بِالتِّجَارَةِ فَاِنَّ فِیْهَا تِسْعَةُ اَعْشَارِ الرِّزْقِ" (تجارت کرو اس میں رزق کا ۹/۱۰ حصہ ہے۔ایک جگہ اور ارشاد فرمایا جو تاجر مشقت اٹھا کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک اناج لے جاتا ہے اور اس دن کے بھاؤ سے فروخت کرتا ہے اس کا درجہ اللہ عزوجل کے یہاں شہید کا سا ہے)، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اَلتَّاجِرُ الْاَمِیْنُ الصَّدُوْقُ الْمُسْلِمُ مَعَ الشُّهَدَآءِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ" (سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۲۴۷ تحقیق محمد فؤاد عبدالباقی (سچا امانت دار مسلمان تاجر قیامت کے دن شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔)

تجارتی ضوابط:

حضور اکرم ﷺ نے تاجروں کے لئے تجارتی ضوابط بھی مقرر فرمائے سورہ نساء میں ہے "اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا" (بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے۔) لہٰذا تاجر کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اعمال سے واقف ہے اور اسے قیامت کے دن جوابدہ ہونا پڑے گا، لہٰذا وہ ہر قسم کی بدعہدی، بے ایمانی، جھوٹ سے باز رہے، حضور ﷺ نے ایک تاجر کو گیہوں کا ڈھیر لیے بیٹھا ہوا پایا، غلہ منڈی سے آپ کا گذر ہو رہا تھا، آپ نے اس ڈھیر میں ہاتھ ڈالا تو اندر سے گیہوں بھیگا ہوا تھا، آپ نے فرمایا کہ: 'ایسا کیوں کیا؟' انہوں نے کہا کہ: 'حضور ﷺ! بارش کی وجہ سے گیہوں بھیگ گیا تھا اس لئے اس کو اندر کر دیا اور اس کے اوپر خشک گیہوں ڈال دیا' حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنَّا"

(جامع ترمذی ج ۱ ص ۱۵۷) جو کسی کو دھوکہ دے اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ گویا وہ طریقہ نبوی پر نہیں ہے، مسلم سماج سے خارج ہے، کتنی شدید وعید یہ اس تاجر کے لئے جو کاروبار میں کسی قسم کی دھوکہ دہی سے کام لیتا ہو۔

ذخیرہ اندوزی کی ممانعت:

مشکوۃ شریف میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَنِ احْتَكَرَ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا يُرِيْدُ بِهِ الْغَلَاءَ، فَقَدْ بَرِئَ مِنَ اللّٰهِ وَبَرِئَ اللّٰهُ مِنْهُ" (مشکوۃ ج ۱ ص ۲۵۱)

(جس نے اشیاء خوردنی کی ذخیرہ اندوزی چالیس روز تک کیے رکھی (یعنی صارفین کو شدید ضرورت کے باوجود وہ اشیاء نہیں پہنچ سکیں) اللہ تعالیٰ اس کی ذمہ داری سے بری ہوں گے۔)

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ: "اَلْجَالِبُ مَرْزُوْقٌ وَّ الْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ" (مشکوۃ ج ۱ ص ۲۵۱) (سوداگر کو رزق ملتا ہے اور ذخیرہ اندوز لعنتی ہے۔) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک ذخیرہ اندوز کا غلہ جلا دیا تھا، مسلم شریف میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "مَنِ احْتَكَرَ وَهُوَ خَاطِئٌ" (مسلم شریف ج ۱ ص ۳۱) (جو شخص ضرورت کے باوجود اس غرض سے غلہ جمع کر کے روک لے کہ نرخ بڑھنے پر بیچے گا تو وہ خطا کار ہے۔)

حرمت سود:

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "مَنْ أَكَلَ الرِّبَا بُعِثَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَجْنُوْنًا يَتَخَبَّطُ" (ترغیب و ترہیب) (سود خور قیامت کے دن پاگل اٹھایا جائے گا۔)

(ابوداؤد) ابن ماجہ میں ہے: "وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ بَابًا اَدْنَاهَا كَالَّذِیْ يَقَعُ عَلٰی اُمِّهٖ" (رواہ البیہقی الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۲)

(حضرت ابو ہریرہ نے ارشاد فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ سود کا گناہ ایسے ستر

گناہوں کے برابر ہے جن میں سب سے کم درجہ گناہ یہ ہے کہ کوئی مرد اپنی ماں سے زنا کرے) علامہ اقبال فرماتے ہیں:

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

ناپ تول میں کمی:

سورۃ المطففین میں ارشاد ہے:

"وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ۔ (سورۃ المطففین)

(ہلاکت ہے ان کے لئے جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں یہ لوگ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب دیتے ہیں یا وزن کم کرتے ہیں تو کم تولتے ہیں۔)

قسمیں کھانا:

حضرت عبید ابن رفاعہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اِنَّ التُّجَّارَ يُبۡعَثُوۡنَ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقَى اللّٰهَ وَبَرَّ وَصَدَقَ۔" (جامع ترندی جا رص ۱۵۲ اسرابوعیسی بن سورۃ الترندی)

(قیامت کے دن تاجروں کا حشر نافرمانوں کے ساتھ ہوگا مگر جو تاجر اللہ تعالی سے ڈرتا ہو، حرام سے بچے جھوٹی قسم نہ کھائے اور سچ بولے تو اس کا حشر فاجروں کے ساتھ نہیں ہوگا۔)

حضرت واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنۡ بَاعَ عَيۡبًا لَمۡ يُبَيِّنۡهُ لَمۡ يَزَلۡ فِيۡ مَقۡتِ اللّٰهِ اَوۡ لَمۡ تَزِلِ الۡمَلٰئِكَةُ تَلۡعَنُهٗ۔" (مشکوۃ ج) ص ۹۳۲)

(جو شخص عیب دار چیز بیچے اور اس کے عیب کو ظاہر نہ کرے تو وہ ہمیشہ

اللہ تعالیٰ کے غضب میں رہے گا اور فرشتے اس پر لعنت کرتے رہیں گے)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اَلْحِلْفُ مُنْفِقَةٌ لِلسِّلْعَةِ مُمْحِقَةٌ لِلْبَرَكَةِ" (مشکوۃ ج ۱) (جو شخص قسم کھا کر سامان بیچے تو اس کا سامان بہت جلد فروخت ہو جاتا ہے لیکن برکت ختم ہو جاتی ہے۔) ایک حدیث میں آیا ہے: "رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا اِذَا بَاعَ وَسَمْحًا اِذَا اشْتَرٰى وَسَمْحًا اِذَا اقْتَضٰى (رواہ البخاری، مشکوۃ ج ۱ ص ۳۳) (اللہ تعالیٰ اس شخص پر مہربانی کرتا ہے جو خرید و فروخت اور قیمت وصول کرنے میں نرمی اختیار کرے۔)

حقیقت ہے کہ اسلام میں جس طرح عبادات و فرائض پر زور دیا گیا ہے اسی طرح کسب حلال اور طلب معاش کو بھی اہمیت دی گئی ہے، آج سے چودہ سو سال قبل حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

"عَلَيْكُمْ بِالتِّجَارَةِ فَاِنَّ فِيْهَا تِسْعَةُ اَعْشَارِ الرِّزْقِ۔"

اور عجیب بات یہ کہ آج کی مہذب ترقی یافتہ دنیا میں نبی کریم ﷺ کا قول مبارک ستارے کی طرح چمک رہا ہے، دنیا کی وہی قومیں آج ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں جو تجارت میں آگے ہوں، خود نبی کریم ﷺ نے تجارت کو بطور پیشے کے اپنایا اور آپؐ کے اکثر و بیشتر صحابہ کا محبوب مشغلہ بھی تجارت ہی تھا، امت کے لئے حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں اسوۂ حسنہ موجود ہے، اور آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام اور بزرگان دین کی پاک زندگیاں ہمارے لئے معیار حق ہیں، تجارت کی یہ فضیلتیں اور تاجروں کے یہ سارے مرتبے جو قرآن و حدیث میں بیان کیے گئے ہیں، حکم کے اعتبار سے عام نہیں بلکہ ضروری ہیں کہ تجارت میں ہر قسم کی فریب کاری، احتکار، جھوٹ، استحصال، مکاری، ملاوٹ، سٹہ اور ان ناپسندیدہ عناصر سے پاک ہو جو اس مقدس ترین پیشہ کو ناپاک بنا دیتے ہیں۔

☆☆☆

کوئی آیا نہ مگر رحمت عالم بن کر

حضرت عمران ابن حسین فرماتے ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی اونٹنی عضباء اصلاً بنو قتیل کے ایک آدمی کی تھی جسے مسلمانوں نے قید کر کے اس سے اس کی اونٹنی چھین لی تھی، وہ خود رسیوں سے بندھا ہوا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ادھر سے گزر ہوا، آپ گدھے پر سوار تھے اور آپ ﷺ کے جسم اطہر پر ایک چادر پڑی تھی، اس نے آپ ﷺ کو پکار کر کہا اے محمد مجھے کس جرم میں قید کیا گیا ہے، اور سفر حج میں استعمال ہونے والی اس اونٹنی کو آپ لوگوں نے کیوں پکڑا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے حلیف اور اتحادی قبیلہ بنو ثقیف کی ایک سنگین غلطی کی وجہ سے ہم نے تمہیں پکڑا ہے، راوی کہتے ہیں کہ بنو ثقیف نے اللہ کے رسول ﷺ کے دو صحابیوں کو گرفتار کر لیا تھا، اس شخص نے دوران گفتگو یہ کہہ کر بھی اپنی رہائی کی کوشش کی کہ میں مسلمان ہوں لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم گرفتار ہونے سے پہلے اس کا اظہار کرتے تو بچ جاتے لیکن اب وقت نکل چکا، ہم فدیہ کے بغیر تمہیں آزاد نہیں کریں گے، اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ آگے بڑھنے لگے تو اس نے کہا اے محمد میں بھوکا پیاسا ہوں کچھ کھانے پینے تو دے دیجئے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہاں تمہاری یہ بات قابل توجہ ہے، پھر ان دو مسلمانوں کی رہائی کے عوض اسے آزاد کر دیا گیا، لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے عضباء کو اپنی سواری کے لئے اپنے پاس ہی رکھا، پھر ایک روز کفار مدینہ کے مویشیوں پر حملہ کر کے انہیں لے گئے، جس میں اللہ کے رسول ﷺ کی اونٹنی عضباء بھی تھی، وہ لوگ ایک مسلمان عورت کو بھی اپنے ساتھ قید کر کے لے گئے، وہ جب کہیں پڑاؤ کرتے تو اونٹوں کو اپنے قریب ہی باندھتے تھے، ایک رات جب سب سو گئے تو وہ عورت چپکے سے اٹھ کر اونٹوں کی طرف چل دی، وہ جب بھی کسی اونٹ کے پاس پہنچتی وہ بلبلانا شروع کر دیتا تھا، لیکن جب وہ عضباء کے پاس پہنچی تو وہ توقع کے بالکل خلاف ایک مانوس اور سدھائے ہوئے جانور کی طرح ایک دم خاموش کھڑی رہی، یہ دیکھ

کر وہ عورت اس پر سوار ہوئی اور اسے مدینہ کی طرف ہانک دیا اور یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے ان ظالموں سے بچالیا تو وہ اللہ کے لئے اس اونٹنی کو ذبح کر دے گی۔ جب وہ مدینہ پہنچی تو لوگوں نے اسے بتایا کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ کی اونٹنی ہے تو اس نے آپ ﷺ سے اپنی نذر کا تذکرہ کیا، اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی بات سن کر فرمایا، واہ بھئی! تم نے بھی اسے خوب بدلہ دیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ تمہیں بچایا اور تم ہو کے اسے مار ہی دینا چاہتی ہو، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا فِيْمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ (نہ گناہ کے کام کے لئے مانگی گئی نذر کا پورا کرنا ضروری ہے، اور نہ کسی دوسرے کے مال کے سلسلہ میں مانی گئی منت کی تکمیل ضروری ہے) (مسند احمد ۴۔۴۳۰، ۴۳۳، ۴۳۴)

فائدہ: اس سے ہمیں یہ فائدہ ملتا ہے کہ قیدیوں کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کرنا چاہئے۔

اللہ کے نبی ﷺ حد درجہ متواضع اور رحم دل تھے کہ ایک قیدی کے اس طرح گستاخانہ انداز میں پکارنے پر بھی خفگی کا اظہار نہیں فرمایا۔

ہم ظاہر کے مکلف ہیں باطن کا حال اللہ جانے ہے

کسی شخص کو اس کے حلیف یا ماتحت کے جرم میں پکڑا جا سکتا ہے۔ قید ہونے کے بعد قبول اسلام غلامی کے منافی نہیں ہے یعنی اگر کسی کافر نے قید میں اسلام قبول کیا ہے تو اسے غلام رکھا جا سکتا، یہ الگ بات ہے کہ اسے بطور احسان معاف کر دیا جائے۔

اس واقعہ سے ایک مسلم خاتون کی شجاعت اور حسن تدبیر کا بھی علم ہوتا ہے۔ گناہ کے کام کی منت مانی جائے تو پوری نہیں کرنی چاہئے۔ دوسرے کے مال میں نذر ماننا جائز نہیں۔ اس واقعہ میں ان فقہاء کے لئے حجت ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نذر معصیت کا کفارہ نہیں ہے۔

اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عضباء اور قصواء الگ الگ اونٹنیاں تھیں، اس لئے کہ قصواء وہ اونٹنی ہے جس پر آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی تھی۔ (شرح الزرقانی علی المواہب: ۳۹۰:۳) یہ بات مومن کی شان کے خلاف ہے کہ وہ کسی کے ساتھ احسان کے بدلے میں بدسلوکی کرے، خواہ وہ محسن جانور ہی کیوں نہ ہو، اللہ کے نبی ﷺ بڑے مہربان اور نرم دل تھے کہ ایک اونٹنی کے ساتھ ناانصافی بھی گوارہ نہیں فرمائی۔

معاشرہ کی تربیت واصلاح اسوہ نبوی کی روشنی میں

اصلاح وتربیت کا کام سب سے پہلے اہم اور ضروری کام ہے، مقاصد کی تکمیل، نوعی افادیت اور تضادات وتنوع کے باوجود توافق وہم آہنگی اصلاح وتربیت سے وابستہ ہے، معاشرہ کسی فرد کا نام نہیں، بلکہ افراد کی حیثیت اس میں ان بنیادی اینٹوں کی ہے جن سے کوئی عمارت تعمیر کی جاتی ہے، اگر اینٹیں پختہ ہوں اور انہیں تناسب سے باہم جوڑ دیا جائے، میٹریئل اعلی درجہ کا استعمال کیا جائے، اور ضرورت کی تمام چیزوں کو تناسب سے فراہم کیا جائے، کسی وقتی جوش وجذبہ کے بجائے بتدریج اور منصوبہ کے مطابق تعمیر کا کام جاری رہے، تو ایک دن ایک خوبصورت بلکہ مثالی اور مستحکم عمارت تیار ہو جائے گی، اسی طرح اگر معاشرہ کے افراد عقیدہ، عمل، اخلاق، معاملات اور تعلیم وتربیت کے مرحلہ سے گزر کر پختہ ہو چکے ہوں اور مسلسل یہ عمل جاری ہو تو معاشرہ مثالی وجود میں آسکتا ہے، دنیا کے تمام مصلحین، مجددین اور انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام معاشرہ کی بگڑتی ہوئی حالت ہی کو سلجھانے کے لئے اپنے اپنے دور میں کوشاں رہے اور نوع انسانی کی بقا اور اصلاح وفلاح کے لئے اپنی ساری کوششیں صرف کرتے رہے، انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام میں حضور ﷺ کا کام اور دعوت واصلاح میں آپ کی ہمہ گیر اور جامع کوششیں انقلابی اثرات کے اعتبار سے سب سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں، لیکن یہ کیسے ہوا، کیوں کر ہوا، کس دور میں ہوا، حضور ﷺ کے سیرت مبارکہ کے اہم ابواب ہیں، ایک جاہل وناخواندہ قوم جس میں مشکل سے چند افراد لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، جو قوم تہذیب وتمدن کے مراکز سے بہت دور اور بے پروا تھی، جنہوں نے شان وشوکت کا ایسا مظاہرہ بھی نہیں دیکھا تھا جو اہل روم وایران اس دور کی دو متمدن حکومتوں کا طرۂ امتیاز بن چکا تھا، قتل وغارت گری جن کا شیوہ تھا، عورت کی بے وقعتی کے لئے یہ کافی ہے کہ اسے زندہ سلامت چھوڑ دینا بھی گوارہ نہ تھا، بچی کی صورت

میں اسے درگور کر کے اپنی نخوت و پندار کی لو کو تیز کرنے کا سامان کیا جاتا تھا، مال کی صورت میں کبھی کبھی وراثت کا ایک حصہ بن کر کسی بیٹے کی ملکیت میں اسے منتقل ہونا پڑتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک برائی تھی جس کے شر سے معاشرہ بوجھل تھا، اور اس سے چھٹکارا پانے کی مختلف خود ساختہ تدبیریں کی جارہی تھیں، عقیدہ کا حال یہ تھا کہ غیر اللہ کا جال بچھا ہوا تھا، گزرا ہوا فرد مقدس اِلٰہ کا درجہ رکھتا تھا، پھر اس کی تصویریں بن جاتیں اور مجسمے نصب کر دیے جاتے، اللہ کے مقدس گھر کعبہ میں تین سو ساٹھ بت ہر سائز اور ہر موقع کے براجمان تھے، خالق کون و مکان کو فراموش کر دیا گیا تھا، چنانچہ انسان جو اپنی ذات سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے نتیجتاً خود فراموشی میں مبتلا ہو چکا تھا۔

لیکن آپ ﷺ کی آمد ناز اور بعثت سرمدی کی برکت سے ایسی بہار آئی کہ فصل خزاں بہار آفریں بن گئی، کنکڑوں اور پتھروں سے ڈرنے والے بڑی بڑی حکومتوں سے ٹکر لینے لگے، اور ان سے اس طرح کی بات کرنے لگے گویا وہ مٹی کی مورت اور کاغذ کے کھلونے ہیں۔

اللہ واحد پر ایمان و یقین نے انہیں بے خوف بنا دیا اور حضور اکرم ﷺ کی تعلیم و تربیت کے اثر سے سارے جہاں کے وہ معلم گردانے گئے، انتشار و انارکی فضا میں بے اطمینانی کی سانس لینے والے، انتظام و انصرام اور قوت اور استحکام میں ایسے آگے بڑھے کہ دارائی و جہاں بانی میں ان کا ثانی نہ ہوا، اخوت، مساوات، محبت، انسجام، راستی و صداقت، صلح و آشتی، خیر خواہی، بہی خواہی، جواں مردی، جاں بازی، جاں نثاری اور جان سپاری کے وہ نمونے پیش کیے جن کے تذکرے سے آج بھی آنکھوں کو ٹھنڈک، دل کو قرار اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے، آپ ﷺ کی تربیت میں رہنے والے ایسے تھے کہ آج بھی انہیں حق و باطل کا معیار سمجھا جاتا ہے، ان کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کی گئی ہے، "علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین"، ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ "اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم" (میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے کسی کی مجموعی اقتدا تمہارے لئے ہدایت کا سامان ہے)، کہیں ان کے حق میں لافانی نغمہ سنایا گیا "اِعْلَمُوْا مَاشِئْتُمْ" (جو تم چاہو کرو)، ان کی ذات پر اعتماد کی ایک بین دلیل ہے۔

دوستوں سے بھی محبت دشمنوں سے وفا بھی

حضرت سعدؓ سے مروی ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو اللہ کے رسول ﷺ نے اہل مکہ کو امان دے دی، صرف چار مردوں اور چھ عورتوں کو اس سے مستثنیٰ کیا اور ان کی بابت حکم دیا کہ جہاں بھی ملیں قتل کر دیے جائیں خواہ بیت اللہ کے پردوں سے چمٹے ہوئے پائے جائیں، وہ چار مرد حسب ذیل ہیں:

(۱) عکرمہ ابن ابوجہل (۲) عبداللہ ابن خطل

(۳) مقیس بن صبابہ (۴) عبداللہ ابن سعد بن سرح

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ عبداللہ بن خطل کعبۃ اللہ کے پردہ سے لپٹا ہوا تھا، سعید ابن حریث اور عمار بن یاسر نے دیکھا تو تیزی سے اس کی طرف لپکے، لیکن حضرت سعید چونکہ نوجوان اور حضرت عمار سے زیادہ پھرتیلے تھے، لہٰذا پہلے اس تک پہنچ گئے، اور اس کا کام تمام کر دیا، دوسری طرف مقیس ابن صبابہ کو لوگوں نے بازار میں پکڑ کر قتل کر دیا، عکرمہ کسی طرح بچ بچا کر ساحل کی طرف نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور کشتی پر بیٹھ کر فرار ہونا چاہا لیکن کچھ ہی دیر ہوئی ہوگی کہ کشتی طوفان میں گھر گئی جب بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا تو کشتی والوں نے کہا کہ سب لوگ ایک خدائے برحق کو پکارو، اس لئے کہ یہاں اس تند و تیز طوفان میں تمہارے معبودان باطل کچھ کام نہ آئیں گے، عکرمہ نے کہا کہ اگر سمندر میں صرف ایک خدا ہی نجات دے سکتا ہے تو یقیناً خشکی میں بھی صرف وہی ایک خدا بچا سکتا ہے، پھر انہوں نے نذر مانی کہ: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس ہلاکت خیز طوفان سے بچا لیا تو میں محمد ﷺ کے پاس چلا جاؤں گا اور ان کی اطاعت قبول کر لوں گا، مجھے یقین ہے کہ وہ ایک نرم دل، مہربان انسان ثابت ہوں گے، چنانچہ اپنی نذر کے مطابق وہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا، آپ ﷺ نے ان کا اسلام قبول فرما کر انہیں معاف فرما دیا،

چوتھے اور آخری شخص عبداللہ ابن سعد ابن سرح حضرت عثمان ابن عفان کے گھر چھپ گئے، جب اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں کو بیعت کے لئے بلایا تو حضرت عثمان ابن عفان انہیں بھی لے کر آئے اور آپ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا، پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! عبداللہ کو بیعت کر لیجئے، آپ ﷺ نے تین مرتبہ سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا گویا تینوں مرتبہ آپ ﷺ نے انکار کرنا چاہتے ہوں، پھر چوتھی مرتبہ آپ ﷺ نے اسے بیعت کر لیا، اس کے بعد آپ ﷺ صحابہ کرام سے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی بھی ہوشیار اور سمجھدار ایسا نہ تھا جو مجھے بیعت سے ہچکچاتے ہوئے دیکھ کر اسے قتل کر دیتا، صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں کیا معلوم کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟ آپ ﷺ نے آنکھ سے ہلکا سا اشارہ کیوں نہیں فرما دیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بات نبی کی شان کے خلاف ہے کہ اس کی آنکھ خیانت کرے۔ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔

مذکورہ بالا حدیث سے ماخوذ فوائد و نتائج:

فتح مکہ اسلام اور مسلمانوں کی عظیم الشان کامیابی تھی جس سے حق غالب اور باطل مغلوب ہو گیا۔ اس واقعہ سے ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کے اخلاق کریمانہ کا بھی علم ہوتا ہے کہ باوجود قدرت اور طاقت آپ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی معاف فرما دیا کرتے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ احکامات الٰہیہ کی پامالی اور اس کے استخفاف پر بہت غصہ ہوتے تھے اور مجرموں کے خلاف سخت سے سخت احکامات جاری کرتے تھے، اور یہ سب خاص اللہ کے لئے تھا، اس لئے کہ آپ اپنی ذات کے لئے کبھی ناراض نہیں ہوتے، آپ کی سیرت اس پر شاہد ہے۔ ایک سچا مومن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی تعمیل کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

دشمنان اسلام کو قتل کرنا بھی جہاد ہے۔ ندامت کے ساتھ توبہ کرنے والوں کو معاف کر دینا چاہئے۔ کسی شہر یا ملک کو فتح کرنے پر ظلم و استبداد اور تشدد و استحصال اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنے صحابہ کی قدر کرتے تھے۔ کسی نیک کام میں سفارش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ نبی ﷺ کے متبعین کو بھی آنکھوں کی خیانت زیب نہیں دیتی۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

زندگی کی شاہراہ میں اسوۂ نبویؐ کی رہنمائی:

اولاد کی خواہش فطری ہے، اللہ عزوجل نے اس فطری خواہش کی تکمیل پر کوئی روک نہیں لگائی ہے بلکہ نسلی امتداد قائم رہے اور خدا کی یہ زمین نسل انسانی سے آباد رہے، اس پر معبود برحق نے اس کے حصول کے جائز طریقے بتائے بلکہ اس کو عین عبادت قرار دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسی عورتوں سے شادی کرنے کا حکم دیا جن کے خاندان کی عورتیں کثرت سے اولاد جنتی ہوں اور شوہروں سے ان کی محبت مثالی ہو، اسی لئے قطع نسل کے جتنے طریقے ہیں شریعت نے انہیں حرام قرار دیا ہے، خواہ وہ لواطت ہو، یا زنا، استمنا بالید ہو یا ایسے جدید طریقے اختیار کیے جائیں جن کی وجہ سے حمل قرار نہ پا سکے، اسی وجہ سے نس بندی اختصاء وغیرہ کی اجازت بھی شریعت نہیں دیتی ہے، اور یہ بھی قتل اولاد کی فہرست میں داخل سمجھا جاتا ہے۔

اولاد اللہ کی نعمت ہے، نوع بشری کا حسین پھول اولاد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے وہ باغ ہی کیا جو پھولوں سے خالی ہو، ہر مالی کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کا باغ پھول و پھل لائے، اور جب اس کے باغ کی ڈالیوں میں پھولوں کے گجرے نظر آتے ہیں تو اس کی باچھیں کھل اٹھتی ہیں، اسی لئے پہلے جب کسی نوجوان کی شادی ہوتی اور اس کی بیوی امید سے نظر آتی تو پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی، سسرال اور مائیکے والے اس کے تحفظ کا پورا لحاظ کرتے اور ایک دن وہ آتا جب آنگن میں خوشیوں کی شہنائی بجتی، لوگ مبارکباد پیش کرتے، حضرت حسن بصری سے دریافت کیا گیا کہ جب کسی کے یہاں اولاد ہو تو ہم کس طرح مبارکباد پیش کریں، فرمایا: "جَعَلَهُ اللّٰهُ مُبَارَكًا عَلَيْكَ وَعَلٰى أُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ"

اللہ اس بچہ کو تمہارے اور امت محمد علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے حق میں مبارک فرمائے، ان الفاظ میں مبارکباد پیش کرو۔

آج مغربی معاشرہ میں اولاد بوجھ بن گئی ہے، نئے جوڑے ایک عرصہ تک چاہتے ہیں کہ اولاد کے بوجھ سے آزاد رہیں، اس کے لئے ایسی دوائیں استعمال کرائی جاتی ہیں جو اس مقصد کے حصول میں معاون ہوتی ہیں لیکن بعد میں ایسے لوگوں کو پچھتانا پڑتا ہے، میرے علم میں ایک ایسا واقعہ ہے جو عبرت انگیز ہے، ہمارے قریبی رشتہ داروں میں ایک عزیز کی شادی ہوئی، رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی، سسرال اسی محلّہ میں تھی، یہاں بیوی کی ملاقات کا علم سسرال والوں کو نہیں تھا، لیکن مائیکے والے واقف تھے، اسی اثناء میں لڑکی امید سے ہوگئی، لڑکے کو جب معلوم ہوا تو بہت پریشان ہوا، اور صرف اس لئے کہ اس کے گھر والوں کو معلوم ہوگا تو وہ اسے اچھا نہیں سمجھیں گے اس نے ایسی دوا کھلا دی جس سے حمل قرار نہ پاسکا اور ضائع ہوگیا، لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کے بعد آج تک حمل قرار ہی پا نہ سکا اب مایوس نڈھال اور کئے پر پچھتانے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، بہت علاج کیا لیکن بے سود، جھاڑ پھونک بھی کرائے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ایسے بھی نوجوان ہیں جو شادی کے بعد محض فیشن میں ایسی غلطی کر بیٹھتے ہیں اور پھر اولاد نہ ہونے پر بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، ان کا دوہرا جرم ہے، انہیں خدا کے غضب سے ڈرنا چاہئے، شادی اولاد کے لئے ہوتی ہے، حظ نفس تو اللہ نے اس کے استحکام کے لئے رکھی ہے، تاکہ نسلی امتداد قائم رہے، آج مغربی تہذیب نے سوچ کے دھارے بدل دیے ہیں، حظ نفس کو اصل سمجھا گیا، جس کی وجہ سے بے مقصدیت شتر بے مہار کی طرح فروغ پا گئی، یہاں تک کہ زندگی اجیرن ہوگئی، اللہ کے رسول ﷺ نے امت محمدیہ کی کثرت پر فخر کا اظہار فرمایا ہے اس میں آپ کی خوشی ہے، اور آپ کی خوشی اللہ عزوجل کی خوشی ہے، اور ایک مسلمان کی معراج یہ ہے کہ اس سے خدا اور اس کا رسول خوش ہو۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

☆☆☆

مسلمانوں کی کامیابی اتباع رسول ﷺ میں ہے

دنیا و آخرت میں کامیابی کے لیے صرف کوششیں کافی نہیں بلکہ وہ کوشش مطلوب ہے جو ایمان سے عبارت ہو اور اس کے لیے اس کے مناسب کوشش کرے اس حال میں کہ وہ مومن ہو۔ (بنی اسرائیل آیت ۱۹)

کامیابی کے لیے آیت کریمہ میں دو شرطیں بیان کی گئی ہیں، پہلی شرط یہ ہے کہ کوشش اس کے منصوبے اور عمل کے حجم کے مطابق ہو، دوسری شرط یہ کہ کوشش کرنے والا آخرت پر یقین رکھتا ہو، معلوم ہوا کہ اگر صاحب ایمان ہو لیکن کوشش اپنے اصل طریقہ کے مطابق نہ ہو تو ضرر لاحق ہوگا، اور یہ ضرر نقد ہوگا۔ اس لیے کہ دنیا مزرعۃ الآخرہ (آخرت کی کھیتی) ہے اور مومن کی منزل مقصود آخرت ہے، سنت طریقہ سے ہٹ کر اگر اس نے آخرت طلب کیا تو دنیا کا بھی ضرر ہے اور آخرت کا بھی، اور اگر صرف دنیا کی طلب ہے تو اس کا ضرر اور دو چند ہے، اس لیے کہ بے وفائی کی سزا تو اس کو ملنی ہی ملنی ہے، عقلاً یہ بات معمولی غور وفکر سے ذہن نشین ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ کسی شخص کی پسند اور ناپسند کا حال جب تک معلوم نہ ہو، جس کو اس نے خود بیان نہ کر دیا ہو، دوسرا شخص کیسے معلوم کر سکتا ہے کہ اس کو ترشی پسند ہے یا شیرینی، وہ مجلسی مزاج کا حامل ہے یا تنہائی اور خلوت کا رسیا، اسی طرح اللہ سبحانہ تعالیٰ کی پسند و ناپسند کا علم انسانوں کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے، اس کو کون سا عمل پسند ہے، اور کس طریقہ سے کیا جائے، اس چیز کو عملی پیکر دینے کے لیے حضرت انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے، اور اس کا نام دین و مذہب ہے اور سنت و شریعت ہے، لہٰذا جو شخص عبادت و ریاضت میں منہمک ہے لیکن اس میں اس کا عمل خانہ ساز شریعت پر ہے تو اس کا یہ عمل خدا کی رضا کا باعث نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ عبادت اور عبادت کا طریقہ بھی اسی نے دیا ہے، اور وہی اسے

پسند ہے، اب اگر کوئی من مانے طریقہ پر عمل کرتا ہے، تو اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے، جو کسی شخص کی رضا کے حصول کے لیے سخت گرمی میں انگیٹھی جلا کر اس کے سامنے رکھ دے، اور سخت سردی میں اس کے سر پنکھا جھلنے لگے، تو خدمت میں سعی و کوشش تو یقیناً پائی گئی لیکن یہ کوشش بجائے رضامندی اور خوشی کے مستحق غضب اور عتاب قرار پائے گی۔

رضا جوئی کے لیے مزاج یار سے آشنائی ضروری ہے، اور یہ بجز وحی ربانی کے کیسے حاصل ہو سکتی ہے، اس لیے تعلیمات نبویؐ اور اسوۂ رسول کو مشعل راہ بنائے بغیر ممکن نہیں کہ ہم اللہ کی رضا اور آخرت کی سعادتیں حاصل کر سکیں، دنیا کی فلاح و سعادت بھی اس راہ مستقیم پر گامزن ہونے میں مضمر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائے گا۔'' (آل عمران)

اور امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''اس امت کے آخری دور کی اصلاح ممکن نہیں بجز اس طریقہ کے جس کے ذریعہ اس کے دور اول کی اصلاح ہوئی۔''

لہٰذا ترقی و کامیابی کے لیے چراغ نبوت سے اکتساب فیض کے بغیر زندگی کے تاریک دریچوں کو روشن نہیں کیا جا سکتا۔

فضول جان کر جس کو بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلاؤ تو روشنی ہوگی

☆☆☆

نسلی تفاخر و امتیاز اور اسوۂ رسول اکرم ﷺ

معاشرتی اور سماجی برائیوں میں نسلی تفاخر ایک ایسی برائی ہے جس کی کوکھ سے بڑی بڑی برائیاں جنم لیتی ہیں، حسد، کینہ توہین وتحقیر کے جذبات معاشرہ میں ناسور کی طرح بڑھتے چلے جاتے ہیں، دلوں میں دوری، باہمی عدم تعاون، اخوت وانصاف کے تقاضے اس کے جلو میں سوخت ہو جاتے ہیں، نسلی تفاخر سے عصبیت اور بے جا حمایت کے جذبہ کو فروغ ملتا ہے، رنگ ونسل اور زبان کو مقدس قرار دے کر بت کی طرح اس کی پرستش شروع ہو جاتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے نسلی تفاخر کے آہنی پنجوں میں انسانیت دم توڑ رہی تھی، قریش کو اپنی نسلی بڑائی کا اتنا غرہ تھا کہ انہوں نے خانہ کعبہ کے طواف کے لئے آنے والوں کو یہ باور کرادیا تھا کہ جب تک ان کا لباس پہن کر وہ طواف نہیں کریں گے ان کی عبادت قبول نہیں ہوگی، لہٰذا آنے والے لباس کرائے پر لے کر پہنتے اور طواف کرتے تھے، یا پھر اپنا لباس اتار کر برہنہ طواف کے لئے جاتے تھے، قریش اپنے آپ کو خانہ کعبہ کا خادم اور متولی سمجھتے تھے، لہٰذا اپنے ہر عمل کو بارگاہ خداوندی میں مقبولیت کی علامت قرار دیتے تھے، لہٰذا تمام قبائل کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے، اس لئے حج کے ایام میں سارے حجاج عرفات میں پہنچ کر وقوف کرتے لیکن قریش صرف مزدلفہ تک ہی جاتے تھے اور دلیل یہ دیتے تھے کہ ہم حرم کے باسی ہیں حدود حرم سے باہر نہیں جاسکتے، اپنے آپ کو مقدس فرد تصور کرتے تھے۔

بعثت نبوی کا مقصد:

نسلی تفاخر کی وجہ سے دوسرے قبائل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان میں شادی بیاہ، لین دین کا معاملہ کرنا فروتر خیال کرتے تھے، لسانی تفاخر کا یہ حال تھا کہ اپنی

زبان آوری کے آگے سارے جہاں کو عجم یعنی گونگا باور کرتے تھے نسلی تفاخر نے ان کے ذہن ودماغ کو اتنا اونچا کر دیا تھا کہ بسا اوقات اس خیال سے کہ کبھی ان کی انا کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے، اور جس قبیلہ میں بچی بیاہی جائے گی اس قبیلے کے سامنے جھکنا پڑے گا، اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے، ایسے وقت میں حضور ﷺ کی بعثت ہوئی، جس کا بنیادی مقصد انسانی عظمت کو قائم کرنا، اور خالق ومخلوق کے درمیان صدیوں سے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنا تھا، جہالت کی تاریکی کو دور کر کے علم کی تنویر کو عام کرنا تھا۔

آپ کی بعثت مبارکہ سے جہالت کی کائی چھٹی، علم کا آفتاب طلوع ہوا، انسانیت کی کھیتی ہری ہوئی، مظلوموں کو سہارا ملا، انصاف کے تقاضے پورے ہوئے، اور انسان کو اولاد آدم ہونے کے ناطے برابری کا درجہ ملا، حضرت بلال حبشیؓ ایک سیاہ فام غلام تھے، وہ سردار بنائے گئے، حضرت سلمان فارسیؓ جو فارسی نژاد تھے بارگاہ رسالت میں باوقار ہوئے عربوں کے مقابلے میں جنگی حکمت عملی میں ان کے مشورے قابل قبول ہوئے، بارگاہ رسالت میں یہ اعلان ہوا کسی عربی کو عجمی پر کسی گورے کو کالے پر اور نہ ہی کسی عجمی کو عربی پر اور نہ کسی سیاہ فام کو سفید فام پر کوئی فضیلت وبرتری حاصل ہے، تم آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے تم میں اللہ کے نزدیک سب سے افضل وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی وپارسا ہو حضور ﷺ نے نسلی غرور وتفاخر کا قلع قمع کرنے کی غرض سے نسلی مساوات کا نمونہ پیش کرتے ہوئے اپنی پھوپھی زاد بہن کی شادی ایک ایسے غلام سے کرائی جسے آزاد کر کے آپ ﷺ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تھا۔

جب مکہ فتح ہوا، خانہ کعبہ کو بتوں سے صاف کیا گیا، نماز کا وقت ہوا تو اذان دینے کے لئے خانہ کعبہ کی چھت پر حضرت بلال کو چڑھ کر اذان دینے کو کہا گیا، یہ ایک اعزاز تھا، ہاشمی مطلبی مخزومی، عدوی، کلبی اور قریش مکہ کے دیگر شاخوں کے افراد موجود تھے لیکن اس مقدس سرزمین کی بارگاہ کی چھت پر آج اسے چڑھایا جارہا تھا، جو کل تک روندا کچلا جارہا تھا، جس کے سینے پر پتھر رکھے جارہے تھے، اور تپتی ہوئی ریت پر ننگے بدن گھسیٹا جارہا تھا، آج اسے سب کی موجودگی میں خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھا کر یہ اعلان کیا جارہا تھا کہ خدا کی

بارگاہ میں حسب ونسب کی کوئی حیثیت نہیں، قرب الٰہی کے لئے ایمان وتقوی اصل سرمایہ ہیں۔

صحابہ کرام کی محبت:

حضور اکرم ﷺ کے صحابہ کرام آپ پر جان چھڑکتے تھے، حضرت ابوبکر کا ایثار، حضرت عمر کا خلوص، حضرت عثمان کی طاعت، حضرت علی کی محبت آپ کے لئے، آپ کے مشن کے لئے، آپ کی دعوت وشریعت کے لئے بے مثال تھی، لیکن قرآن پاک میں اگر کسی کا نام آیا ہے، تو صحابہ کرام میں صرف اس غلام کا آیا ہے، جس کو حضور ﷺ نے غلامی سے آزادی عطا کی تھی، اور اپنے گھرانے کا ایک فرد بنایا تھا، قرآن پاک نے حضرت زید کے نام کو ان کے کردار کو دوام عطا کیا، اور اگر کسی قریشی کا نام آیا تو ابولہب کا آیا، جس پر تباہی و ہلاکت مسلط کی گئی۔

لہٰذا اسلام نسلی امتیاز کا قطعاً روادار نہیں، اس نے اسی لعنت پر گہری ضربیں لگائی ہیں، اور اس کی جڑیں زمین کی اندرونی تہوں سے کھود کر اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اس نے اعلان کیا ہے کہ اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور بعد میں تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے تا کہ اس سے تم ایک دوسرے کو پہچان سکو لیکن (جہاں تک عزت وذلت کی بات ہے) زیادہ عزت دار وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ (الفرقان)

☆☆☆

نومولود بچے کی ولادت اور سنت نبویؐ

اولاد اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، والدین کی خوبیوں کا امین، ان کے خوابوں کی تعبیر نسلی امتداد کا محرک، آنکھوں کی ٹھنڈک، قوت بازو، اور خانگی نیرنگیوں کی روح اولاد ہی کا عکس جمیل ہے۔ اگر اولاد نہ ہو تو گھر اندھیرا اور سونا معلوم ہوتا ہے، اولاد عطا کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے، وہ جسے چاہے بیٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹی، اور جس کو چاہتا ہے بیٹا اور بیٹی دونوں عطا کر دیتا ہے اور جب اس کی مشیت نہیں ہوتی تو دونوں سے محروم کر دیتا ہے۔

نعمت کی قدر یہ ہے کہ حتی الامکان اس کی قدر و قیمت کو سمجھا جائے اس پر توجہ دی جائے اس کے جو تقاضے ہیں انہیں پورا کیا جائے، جس طرح ایک پودا لگاتے ہیں تو اسکی نشو ونما کی فکر کرتے ہیں، گرما اور سرما کے مضر اثرات سے حفاظت کرتے ہیں، کڑی نگرانیوں میں وہ پودا تناور درخت بنتا ہے، اور باغباں کو اس کا پھل ملتا ہے، اور جو توجہ نہیں دیتا، اس کا باغ پھل لانے کی عمر تک پہنچتے پہنچتے خشک ہو جاتا ہے، یا بے ثمر ہو جاتا ہے، اس طرح اولاد کی دیکھ ریکھ، اور صحیح تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، اولاد صالح کی تمنا رکھنے والوں کے لئے شریعت نے یہ بھی رہنمائی فرمائی ہے کہ جس وقت مرد عورت کے پاس ہو اور انزال کا وقت ہو جائے تو اسے یہ دعا پڑھنی چاہئے تا کہ اولاد صالح ہو اور شیطانی اثرات سے پاک ہو "بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنِی الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَا رَزَقْتَنِیْ" (بسم اللہ اے اللہ مجھے شیطان سے دور رکھ اور شیطان کو میری اولاد سے دور فرما)، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جو یہ دعا پڑھ لے تو اس کی اولاد کو کبھی شیطان نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ (بخاری و مسلم)

جب بیوی امید سے ہو تو زن و شو باہم محبت انس دیگانگت کا مظاہرہ کریں، آپس میں لڑے جھگڑے نہیں، اس لئے کہ رحم مادر میں پرورش پانے والا جنین خارجی مؤثرات کی

گرفت میں ہوتا ہے، جس طرح کیمرے کی آنکھیں جسم کے اندر کے مخفی گوشوں تک پہنچ کر ایک ایک چیز کو مشاہد بنا دیتی ہیں، ایسے ہی جنین کی پرورش میں والدین کے سلوک کا خاصہ دخل ہوتا ہے۔

ایسے وقت میں اللہ کی طرف رجوع کرتے رہنا چاہئے، جب کہ حمل کے زمانے میں ڈاکٹر سے رجوع کرتے رہتے ہیں تا کہ ولادت کا مرحلہ آسان ہو، تو جس ذات نے اس جنین کے استقرار و نشو و نما کا سامان کیا ہے، اس کی طرف تو بدرجہ اولی توجہ کرنا اور اس کو راضی رکھنے کی فکر کرنا لازمۂ عقل قرار دیا جائے گا، قرآن پاک میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے:

"فَلَمَّا أَثْقَلَتْ دَعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ۔ (الاعراف:۱۸۹)

(تو جب حمل ظاہر ہو گیا تو دونوں نے اپنے رب کو پکار پکار کر کہا کہ اگر تو ہمیں صالح اولاد عطا فرمائے تو ہم یقیناً مشکور ہوں گے۔)

لیکن کتنے مسلمان ایسے ہیں جنہیں اس کی طرف توجہ ہوتی ہے، ہزاروں روپے کی دوا، اور درجنوں قسم کے ٹیسٹ ضرور کرائے جاتے ہیں لیکن دینے والے کریم مالک کو فراموش کر دیا جاتا ہے، لہٰذا اولاد بھی صالح کے بجائے طالح، باکردار کے بجائے بے کردار، فرمانبرداری کے بجائے نافرمانی کرنے والی ہوتی جارہی ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس وقت بھی اپنے اثرات ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، بچہ کی معصوم فطرت اس کو قبول نہیں کر پاتی اس لئے پیدا ہوتے ہی بچہ کی چیخ نکل جاتی ہے، اس زہر کا تریاق اس اذان و اقامت میں ہے، جو نومولود بچے کے کان میں کہی جاتی ہے، اس طرح بچہ دینی فطرت کی آواز پر پروان چڑھتا ہے اور اللہ کی کبریائی کی شہنائی اس کے کانوں میں بجتی رہتی ہے، اور کشاں کشاں وہ طاعت الٰہی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے، جہاں کامیابیاں سرنگوں اور سرفرازیاں قدم بہ قدم اور ابدی سعادت کی شاہ کلید اس کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔

☆☆☆

رحمت عالم

(صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ فتح مکہ کے بعد صفوان ابن امیہ جدہ مکہ کے ساحل کی طرف نکل گیا تا کہ وہ وہاں سے یمن چلا جائے، عمیر ابن وھبؓ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے اللہ کے رسول ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ صفوان ابن امیہ اپنی قوم کا سردار ہے، اور وہ آپ سے بچنے کے لئے سمندر میں کودنے کو تیار ہے، اسے آپ پناہ دے دیجئے تا کہ وہ یہ انتہائی قدم نہ اٹھائے اور اس کی جان بچ جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ اسے امان ہے، انہوں نے دوبارہ عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی نشانی دے دیجئے جسے دیکھ کر اسے آپ ﷺ کی طرف سے امان دیے جانے کا یقین آجائے، اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عمیرؓ کی درخواست پر ان کو اپنا وہ عمامہ عطا کر دیا جسے باندھ کر آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تھے۔

حضرت عمیرؓ آپ ﷺ کا عمامہ لے کر روانہ ہوئے، جب وہ ساحل پر پہنچے تو دیکھا کہ صفوان کشتی پر سوار ہی ہوا چاہتا ہے، فوراً لپک کر اس کے پاس پہنچے اور کہا صفوان! تم پر میرے ماں باپ قربان، کیوں اپنے آپ کو ہلاک کرنا چاہتے ہو، یہ دیکھو میں تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے امان کی خوشخبری لے کر آیا ہوں، اس نے جھڑک کر جواب دیا: دور ہٹو اور مجھ سے بات مت کرو، حضرت عمیرؓ نے پھر نرمی سے سمجھایا کہ دیکھو اللہ کے رسول ﷺ تمہارے ہی خاندان کے تو ہیں، ان کی عزت تمہاری عزت ہے اور ان کی حکومت تمہاری حکومت ہے، وہ بڑے حلیم، نرم مزاج اور پاک طینت ہیں، میرے ماں باپ تم پر قربان، چلو یہاں سے واپس چلو، اس نے کہا: مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے،

حضرت عمیرؓ نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ آپ ﷺ ایسا کر ہی نہیں سکتے، صفوان آپ ﷺ کی شرافت مہربانی آپ ﷺ کو اس کی اجازت ہی نہ دے گی۔ جب اسے کچھ اطمینان ہوا تو وہ حضرت عمیر کے ساتھ مکہ مکرمہ واپس چلا آیا، اور اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، یہ عمیرؓ ابن وہب کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے امان دے دی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: یہ بالکل سچ کہتے ہیں، میں واقعی تمہیں امان دے چکا ہوں، اس نے عرض کیا: مجھے دو مہینے غور کرنے کا موقع دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا: دو کیا؟ جاؤ تمہیں چار مہینے کی مہلت ہے۔ (اخرجہ ابن الحلق کمافی البدایہ والنہایہ)

درج بالا قصہ سے اخذ کردہ مسائل وفوائد:

انبیاء کرام کا وجود دنیا کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے نہ کہ باعث زحمت اسی لئے نابین انبیاء کا وجود بھی لوگوں کے لئے راحت و آرام کا سبب ہونا چاہئے نہ کہ تکلیف اور پریشانی کا، قدرت ہوتے ہوئے معاف کر دینا اعلیٰ ظرفی و بلند حوصلگی کی بات ہے۔

اظہار حقیقت کے لئے دلائل و براہین پیش کرنا قائل کے سچے ہونے کی علامت ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنی دعوت کی اشاعت اور اس کے فروغ کے لئے مصالحانہ طرز اختیار فرماتے تھے اور تشدد انتہا پسندی سے اجتناب کرتے تھے۔

اللہ کے رسول ﷺ کسی طرح لوگوں کو اسلام میں داخل کرنے کے لئے بیتاب و بیقرار رہا کرتے تھے۔ صحابہ کرام کو آپ ﷺ کے اخلاق کریمانہ وحلم و بردباری پر اس درجہ اعتماد تھا کہ حضرت عمیرؓ نے صفوان ابن امیہ سے پورے وثوق کے ساتھ اس بات کی ضمانت لے لی کہ آپ اسے معاف کر دیں گے۔

استعارہ کا استعمال جائز ہے، حضرت عمیرؓ نے صفوان کے بحری سفر کو سمندر میں کود پڑنے سے تعبیر کیا۔ اعزاء واقارب کی ایمانی ودینی پہلو سے فکر رکھنا ان کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ اسلام نے اظہار رائے کی آزادی دی ہے، بشرطیکہ وہ کسی دینی نقصان کا سبب نہ بن جائے۔

☆☆☆

روشنی بخش دی زمانہ کو

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جنگ بدر کے بعد جب اہل مکہ نے اپنے اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لئے اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں زرفدیہ بھیجا تو اللہ کے رسول ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے بھی اپنے شوہر ابوالعاصؓ کو جنہیں مسلمانوں نے قید کرلیا تھا، چھڑانے کے لئے کچھ مال روانہ کیا، جس میں وہ ہار بھی تھا جو ان کی والدہ حضرت خدیجہؓ نے ان کو ابو العاصؓ کے ساتھ رخصت کرتے وقت دیا تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے جب اس ہار کو دیکھا تو بے قرار ہو کر اٹھے اور آپؐ پر غیر معمولی تاثر ہوا، آپ ﷺ نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: اگر تم مناسب سمجھو تو زینبؓ کے قیدی کو یوں ہی آزاد کر دو اور اس کا سامان اسے واپس لوٹا دو، صحابہ کرامؓ تو ہمہ وقت جاں نثاری و فرمانبرداری کے لئے تیار رہا کرتے تھے، فوراً عرض کیا حضور! آپ ﷺ کا حکم سر آنکھوں پر، ہم بخوشی راضی ہیں۔

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے:

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ابوالعاصؓ کو آزاد کر دیا گیا اور حضرت زینبؓ کا سامان بھی واپس کر دیا گیا۔ (اخرجہ الحاکم: ۲۳۶/۳)

ایک دوسری روایت میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ بھی ہجرت کے ارادہ سے کنانہ یا ابن کنانہ کے ساتھ نکلیں، قریش کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے تعاقب کیا، کسی طرح ان کا ایک آدمی ہبار بن اسود حضرت زینبؓ کے قریب پہنچ گیا، اس نے انہیں

روکنے کے لئے ان کے اونٹ پر نیزوں سے پیہم وار کیے جس سے حضرت زینبؓ نیچے آگریں اور خون کا فوارہ جاری ہوگیا، اس نازک اندام شہزادی کے لئے یہی جسمانی تکلیف کیا کم تھی کہ دوسری طرف ہند بنت عتبہ بن ربیعہ یہ کہہ کر انہیں روحانی اذیت دیا کرتی تھی کہ یہ سب تمہارے باپ کی وجہ سے ہوا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کو جب ان حالات کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو مکہ مکرمہ سے حضرت زینبؓ کو لانے کی ذمہ داری سونپی جسے انہوں نے بحسن وخوبی نبھایا۔

ہوا یوں کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے زینبؓ کو مکہ لانے کی بات کی تو آپ ﷺ نے انہیں اپنی انگوٹھی دے کر کہا کہ یہ انگوٹی زینبؓ کو دے دینا، وہ اسے پہچان لے گی، حضرت زیدؓ آپ ﷺ کی انگوٹھی لے کر روانہ ہوئے، مکہ مکرمہ پہنچ کر ان سے ملنے کی مختلف تدابیر کرتے رہے حتی کہ ایک روز ان کی ملاقات ایک چرواہے سے ہوئی تو انہوں نے پوچھا تم کس کے خادم ہو، اس نے بتایا کہ ابوالعاص کا، انہوں نے پھر پوچھا، یہ بکریاں کس کی ہیں؟ کہا زینب بنت محمد ﷺ کی، کچھ دور تک وہ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے اس کے ساتھ چلتے رہے پھر اچانک موضوع بدل کر بولے، یہ بتاؤ، اگر میں تمہیں کوئی امانت دوں تو کیا تم خاموشی سے زینب تک پہنچا سکتے ہو؟ اس نے فوراً کہا، کیوں نہیں؟ بالکل پہنچا دوں گا، حضرت زیدؓ نے وہ انگوٹھی اس کے حوالے کر دی جسے لے کر وہ آگے بڑھ گیا، جب بکریاں لے کر گھر پہنچا تو چپکے سے وہ انگوٹی حضرت زینبؓ کو دے دی، انہوں نے اسے دیکھتے ہی پہنچان لیا اور بڑی بے تابی سے پوچھا، تمہیں یہ انگوٹھی کہاں سے ملی، اس نے بتایا ایک اجنبی نے مجھے آپ تک پہنچانے کے لئے دی تھی، انہوں نے دوبارہ معلوم کیا، تم نے اس آدمی کو کہاں چھوڑا تھا؟ اس نے ان کا پورا پتہ بتا دیا، یہ سن کر وہ خاموش ہوگئیں، رات ہوئی تو خاموشی سے اٹھ کر دبے پاؤں اسی طرف چل دیں جہاں ان کے چرواہے کی حضرت زیدؓ سے ملاقات ہوئی تھی، حضرت زیدؓ وہیں موجود تھے، حضرت زینبؓ کو آتے ہوئے دیکھا تو فوراً اونٹ کو آگے بڑھا کر کہا: آپ اونٹ پر تشریف رکھئے، میں پیچھے بیٹھتا ہوں، حضرت زینبؓ نے فرمایا نہیں، آپ آگے بیٹھئے، میں پیچھے بیٹھوں گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت زیدؓ

آگے سوار ہوئے اور حضرت زینب پیچھے بیٹھیں، اسی طرح وہ دونوں مدینہ پہنچے، اللہ کے رسول ﷺ ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے، آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے یہ میری سب سے اچھی بیٹی ہے جس میں نے میری خاطر بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ (اخرجہ الحاکم: ۳/۲۳۶)

ابوالعاص بہت بڑے تاجر تھے، چند سال کے بعد بڑے ساز وسامان سے شام کی طرف مال تجارت لے کر نکلے، واپسی پر مسلمان دستوں نے ان کے ہمراہیوں کو مع تمام مال واسباب گرفتار کرلیا، ابوالعاص کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے، رات ہوئی تو اپنے مال کی واپسی کے لئے چھپ کر حضرت زینبؓ کے پاس پہنچے، انہوں نے پناہ دے دی، جب اللہ کے رسول ﷺ فجر کی نماز کے لئے مسجد تشریف لے گئے اور آپ ﷺ نے تکبیر کہی تو حضرت زینبؓ نے پکار کر کہا: اے لوگو! میں نے ابوالعاص بن ربیع کو پناہ دی ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے نماز کے بعد صحابہ کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا: اے لوگو! تم نے وہ آواز سنی جو میں نے سنی؟ لوگوں نے عرض کیا: جی حضور ﷺ ہم نے بھی سنی ہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے، مجھے اس بات کا اب تک بالکل علم نہیں تھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا ادنیٰ فرد بھی اگر کسی کو پناہ دے تو اس کی بات کا احترام لازم ہے، اس کے بعد آپ نے حضرت زینبؓ کے پاس تشریف لے گئے، اور فرمایا: بیٹی! ابوالعاص کی ضیافت اور اعزاز میں کوئی کمی نہیں کرنا، لیکن اس کے پاس مت جانا کہ اب تم ان کے لئے حلال نہیں رہیں۔ (اخرجہ الحاکم: ۳/۲۳۶)

آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ اگر مناسب سمجھو تو ابوالعاص کا اسباب واپس کردو، پھر تسلیم کی گردنیں جھک گئیں، اور سپاہیوں نے ایک ایک دھاگا تک لالا کر واپس کردیا، اب یہ دار ایسا نہ تھا جو خالی جاتا، ابوالعاص مکہ مکرمہ آئے اور تمام شرکاء کو حساب سمجھا کر دولت اسلام سے بہرہ ور ہوئے اور کہہ دیا کہ میں اس لئے یہاں آیا تا کہ حساب سمجھا کر جاؤں کہ تم یہ نہ کہو کہ ابوالعاص ہمارا روپیہ کھا کر تقاضے کے ڈر سے مسلمان ہوگیا۔ (اخرجہ الحاکم ۳/۲۳۷)

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کے ایک دستہ

کو روانہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر فلاں فلاں آدمی تمہیں ملیں تو انہیں جلا ڈالنا، پھر جب وہ لوگ چلنے لگے تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا میں نے فلاں فلاں لوگوں کو جلانے کا حکم دیا تھا لیکن اب میں یہ کہتا ہوں کہ انہیں جلانا نہیں، کسی اور طرح قتل کرنا، اس لئے کہ آگ کا عذاب دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ (اخرجہ احمد: ۳۰۷/۲)

نوٹ: روایتوں میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جن لوگوں کو مارنے کا حکم دیا تھا ان ہی میں سے ایک ھبار ابن اسود اور دوسرا نافع بن عبد قیس تھا۔

دروس وفوائد: قیدیوں کا تبادلہ جائز ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ حضرت خدیجہ سے بہت محبت فرماتے تھے۔

شادی کے موقع سے جو ہدیہ یا تحفہ دیا جاتا ہے اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

مقصد تک پہنچنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

سفر میں مرد کا عورت سے آگے رہنا زیادہ محتاط اور محفوظ طریقہ ہے۔

☆☆☆

سیدالاولین والآخرین کے امتیازات عالمی تناظر میں

حضور ﷺ نے فرمایا کہ: مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں، ایک ماہ کی مسافت تک مجھے رعب عطا فرما کر میری مدد کی گئی، زمین کو میرے لئے جائے نماز اور طہارت کا ذریعہ بنایا گیا ہے، لہٰذا میری امت کا کوئی بھی فرد نماز کا وقت پالے تو نماز پڑھ لے، مجھ سے پہلے کسی کے لئے مال غنیمت حلال نہ تھا، میرے لئے اسے حلال کیا گیا ہے، مجھے شفاعت کا اعزاز بخشا گیا ہے، پہلے نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے، مجھے ساری انسانیت کی طرف بھیجا گیا ہے۔ (بخاری ومسلم)

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں، اگر ان نعمتوں کو شمار کیا جائے تو شمار کرنا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" (سورہ ابراہیم) بہت سی نعمتوں میں ساری انسانیت شریک ہے، کسی کے لئے خاص نہیں ہیں، مثلاً ہوا، پانی، زمین، روشنی، آسمان، سیارگان فلک، موسموں کی آمد ورفت، بہار وخزاں کا نشیب وفراز، کوہ ودمن کی رعنائیاں، خیابانوں کی گل افشانیاں، دریاؤں کا تموج، سمندروں کا سکوت سب کے لئے ہیں، آفتاب کی کرنیں اور چاند کی چاندنی سب کے لئے لطف فراواں کا باعث ہیں۔

لیکن کچھ مخصوص نعمتیں ہیں جن سے اللہ عزوجل نے بعض مخصوص بندوں کو نوازا ہے، جس طرح نبوت سے انہیں سرفراز فرمایا ہے، اسی طرح ان نعمتوں سے بھی خاص طور پر بہرہ ور کیا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک کو خاص خاص لطف وانعام سے سرفراز کیا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کو صفوت، انتخاب، اور اسماء کے فہم کا شرف عطا فرمایا، حضرت نوح علیہ السلام کو جدو جہد اور عزم وارادہ کی روح عطا کی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ابوالانبیاء عشق توحید، اور خلیل اللہ کے درجہ سے بہرہ ور کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تعلیم و

تربیت، عمرانیات، معاشرہ کا نظم ونسق اور حسن سلیقہ سے بہرہ ور کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نرمی وشفقت، صبر وتحمل، معاشرہ میں رواداری اور محبت کی نشر واشاعت کے وصف سے سرشار فرمایا، اور سرور کونین حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت کو ارادے، حکمت، اعتدال و میانہ روی اور تحلیل وترکیب فہم وفراست جیسی صفات سے نوازا، جو عالمی پیغام کے لئے ضروری ہوتی ہیں، نیز سابقہ انبیاء کرام کی صفات اس پر مستزاد ہیں، یہی وجہ ہے کہ دین اسلام تمام مذاہب سے زیادہ ذمہ داریوں کا حامل ہونے کے باوجود سب سے زیادہ نرم، بلند مرتبہ، بابرکت اور انسانی صفات سے قریب تر ہے، اس لئے اسلام بجاطور پر عالمی مذہب کہلانے کا مستحق ہے۔

لہٰذا یہ حدیث مبارک اس عالمی اور جامع پیغام رسالت کو انتہائی دلکش انداز میں غور وفکر کے لئے پیش کر رہی ہے، جب اس عالمی دین اور اس کے جامع پیغام کو لے کر اس کے اولین داعیوں نے تگ و دو شروع کی اور اپنے نبی ﷺ کی قیادت میں اسلام کی حقانیت کو بجاطور پر ثابت کرنے کے لئے نکل پڑے، تو ان کے سامنے ہر طاقت لرزاں و ترساں نظر آئی، اور دیکھتے دیکھتے صدیوں کے قلعے اسلام کی ضرب سے بکھر کر رہ گئے، اور اس کا رعب ایسا طاری ہوا کہ چند سال کی مدت میں لاکھوں میل مربع پر اسلام کی حکومت قائم ہوگئی، اس لئے "نصرت بالرعب مسیرة شهر" ایک ماہ کی مسافت تک رعب عطا کر کے میری مدد کی گئی ہے، کا وعدہ مخلص اہل ایمان کا خوفناک اسلحہ اور مضبوط قلعہ ہے، آج دنیا اسی رعب یزدانی سے خائف ہے، اور اس کی آواز کو دبانے کے لئے لاکھوں قسم کے جتن کیے جارہے ہیں لیکن

نور خدا ہے کفر کی حرکت پر خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

دوسری صفت اس دین کا مزاج عالمی ہے، لہٰذا اسے زمین وآسمان کے قید و بند سے آزاد کیا گیا ہے، پوری روئے زمین عبادت کا محل ہے، اور ہر فرد اس کی ادائیگی پر قادر ہے شرط یہ ہے کہ وہ بالغ ہو، مسلمان اور عاقل ہو، یہاں رجال الدین کا وہ تصور نہیں ہے جو

دیگر مذاہب میں لازمی عنصر کا درجہ رکھتا ہے۔

آپ ﷺ کی رسالت عالمی ہے، علاقہ، رنگ و نسل کی قید کی چھاپ سے وہ آزاد ہے، تمام عالم کے آپ ہادی ہیں، اور سب کی دینی، ایمانی اور روحانی ضرورتوں کا تکفل اب آپ ﷺ کے بغیر نہیں ہوسکتا ہے۔

معاشیات کے میدان میں بھی دیگر قوموں کے مقابلہ میں وسعت دی گئی، دشمن کے مال کو اگر حاصل کیا گیا ہے تو اس کو اپنے استعمال میں لایا جاسکتا ہے، اس پر جو صدیوں سے قدغنیں عائد تھیں وہ یک لخت ختم کردی گئیں، اسلام کے مزاج میں فطرت انسانی سے جو قرب ہے اس کا یہ امتیازی وصف ہے۔

اس طرح آخرت میں آپ ﷺ کو شفاعت کبریٰ سے نوازا گیا ہے، یہ اس امت کے لئے بڑا اعزاز ہے، جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، اس وقت جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے لوگ شاد کام ہوں گے، آسانیاں پیدا ہوں گی، اور بالآخر جنت کے فیصلوں میں اس شفاعت کبریٰ کا اثر نظر آئے گا۔

حدیث شریف سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ نبوت و رسالت ایک عطیہ خداوندی ہے جسے انسانی کدوکاوش سے حاصل نہیں کیا جاسکتا، یہ مذکورہ بالا خصائص دعوت محمدی ﷺ کے امتیازات ہیں، یہ کسی نبی اور رسول کو عطا نہیں کیے گئے۔

☆☆☆

تذکرہ رسول عربی ﷺ ویدوں اور پرانوں میں

نبی آخر الزماں سرور کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام نے اپنے اپنے دور میں دی ہے جو آج بھی اہل کتاب کی کتابوں میں واضح الفاظ میں موجود ہے، جس کا اعتراف خود یہود مدینہ کو بھی تھا لیکن تعصب نے انھیں اظہارِ حقیقت سے باز رکھا تھا اور ان آیات کو بھی چھپاتے رہے جس میں بعثت کی خبر مذکور تھی۔ لیکن حقیقت، حقیقت ہے وہ منوالیتی ہے، ہر چند کہ ماننے سے گریز ہی کیا جائے۔

حقیقت مثل مہر و ماہ لوح دل پہ ہے تاباں
وہ منواتی ہے اپنے کو، کبھی مانی نہیں جاتی

توریت، زبور، انجیل اور دیگر صحائف میں جس طرح اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے، اسی طرح ویدوں، پرانوں، اپنشدوں میں بھی آپ کی بعثت کی خبر مذکور ہے اور اس پیشین گوئی کو برادرانِ وطن صحیح بھی سمجھتے ہیں، لیکن افسوس کہ آئے ہوئے کو تسلیم نہ کر کے انتظار کی تنگ و تاریک راہ داریوں میں بھٹک رہے ہیں۔ اب اس موضوع پر کئی کتابیں اردو اور ہندی میں آچکی ہیں اور بعض انصاف پسند ہندوؤں نے بہت کھل کر لکھا ہے اور ہندوؤں کو دعوت دی ہے کہ تم جس کلکی کی آمد کے منتظر ہو، وہ عرب کی سرزمین شامل دیپ میں آج سے چودہ سو سال پیشتر آچکا ہے۔ جس کی دعوت عام ہو چکی ہے۔ جس کی اتباع ہی میں نجات کی راہ مضمر ہے۔ تلسی داس نے اس سچائی کو یوں بیان کیا ہے: "سنگ رام پر ان میں ان کی یہ چوپائیاں آج بھی موجود ہیں جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر انسان کا ایمان لانا ضروری بتایا گیا ہے۔

(۱) یہاں کچھ بات کہوں کچھ راکھوں ۔۔۔ وید پران ست ست بھاگوں
(۲) برکھ سہس دس سندرم ہوئے ۔۔۔ نہ کے بعد نہ پائے کوئے
(۳) دیس عرب بھرک لتا سہائے ۔۔۔ سونہل بھوم گت سوکھگ رائے
(۴) سمبھو سمت ناکر ہوئے ۔۔۔ سندرم رام وایس تھتھ سوئے
(۵) وہی سمت بکرم کی دوا لگا ۔۔۔ مہا لوک تس چیز پتیگا
(۶) چتہ سندرم چپ جاری ۔۔۔ تنگی نہیں ہوئی بھو بھاری
(۷) نب تک سندرم جبھی کوئے ۔۔۔ بنا محمدؐ یار نہ ہوئے
(۸) بن چار بچار دھنشیا ۔۔۔ دھنش بھیجیں جات کلیا
(۹) سوسا جج کمٹ تر پاویں ۔۔۔ سردور ویداس کو بکھا دیں
(۱۰) پر سندرم تماں نہیں ہوئے ۔۔۔ تلسی بچن ست ست کوئے

(منقول سرور عالم جگت گرو ص ۵۵-۵۶)

ترجمہ:

(۱) آپ کی طرف داری میں کچھ نہ کہوں گا۔ ویداور پرانوں میں جو کچھ ہے وہی کہوں گا۔
(۲) دس ہزار برس کی ولایت تمام ہوگی پھر اس کے بعد کوئی یہ مرتبہ نہیں پاسکتا۔ (یعنی ختم نبوت)
(۳) دیس عرب میں جمعہ کا خوشنما ستارہ طلوع ہوگا۔ کیا ہی شان کی زمین ہے، اے فرسودہ خیال کے لوگو اس کی حقیقت سنو۔
(۴) انہونی بات یعنی معجزے اس کے ظہور میں آئیں گے۔ ولایت الٰہی قائم ہوگی۔
(۵) سمت بکر ماجیت کی سمندروں کی تعداد کے موافق یعنی ساتویں صدی میں کیونکہ سمندر سات ہیں، اندھیری رات میں مانند چار آفتاب کے چمکے گا۔
(۶) عاقل اللہ کے بھوک یعنی خلیفے چار ہوں گے ان سے بہت بھاری نسل پیدا ہوگی۔
(۷) اس دین کے جاری رہنے تک جو کوئی خدا تک پہونچنا چاہے بے وسیلہ محمد کے نہیں پہونچے گا۔

(۸) چھوت چھات، پوجا پاٹ چھوڑ کر جو آئے وظیفہ پائے، اس کے نام سے ذات پات دور ہوئیں۔ اس سے دین و دنیا کی فکر کریں۔

(۹) اللہ کی محبت میں مٹ جائیں گے اور وہی نجات پائیں گے۔

(۱۰) ان کے بعد پھر ولایت نہ ہوگی تلسی داس یہ بات بالکل سچ سچ کہتا ہے۔

بھاگوت اور کلکی پران میں لکھا ہے کہ جگت گرو کلکی اوتار کی پیدائش کی جگہ شامل دیپ ہوگی، شالمل کو بعض لوگوں نے سنبھل سمجھ کر اس پیشین گوئی کو وہاں تلاشنے لگے جو مراد آباد کے مضافات میں مشہور قصبہ ہے۔ اگر شالمل کے بجائے سنبھل بھی مانیں، تب بھی ڈاکٹر وید پرکاش اپادھیا کی تصریح کے مطابق سنبھل سے مراد مکہ مکرمہ ہے نہ کہ قصبہ سنبھل مراد آباد۔ بھاگوت پران کے اٹھارہویں باب میں مقام پیدائش کا تذکرہ یوں آیا ہے۔

سنبھل گرامکھیں براہمن ایس مہاتمن بھونے ویشنو کلکی پر اور بھوشیش

ڈاکٹر اپادھیا نے لکھا ہے کہ آخری نبی کی بعثت مقام سنبھل میں ہوگی اور سنسکرت میں ایسی جگہ کو کہتے ہیں جو مامون و محفوظ ہو، جہاں خونریزی قطعاً ممنوع ہو۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ آیا ہندوستان میں کوئی ایسا مقام ہے جو سنبھل یعنی محفوظ و مامون ہو۔ لیکن ہمیں کوئی ایسا مقام نہیں ملتا جو ان ساری صفات کا حامل ہو۔ اور پھر وہاں کوئی ایسا عظیم آدمی بھی پیدا ہوا ہو۔ جب یہاں کوئی ایسا مقام نہیں ملتا تو لازمی طور پر ہمارا ذہن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مقام بعثت کی طرف جاتا ہے کیونکہ سنبھل کے معنی امن و سلامتی کی جگہ کے ہیں اور مکہ مکرمہ جہاں آپ کی بعثت ہوئی۔ حرم آمن یعنی محترم و مامون کہلاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے: "اَوَلَمْ تُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا" (ابراہیم) (کیا ہم نے ان کو حرم (مکہ) میں (جہاں ہر طرح کا امن واطمینان ہے) جگہ نہیں دی): وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا۔ (ابراہیم) (اور جب ابراہیم (خدا سے) دعا کی: اے میرے پروردگار! اس شہر مکہ کو امن کی جگہ بنادے۔) (سورہ ابراہیم)

وہ ایسی جگہ ہے جہاں شکار بھی ممنوع ہے۔ حتی کہ حاجی سر کے جوئیں بھی نہیں مار سکتے اور نہ ہی کسی دوسرے کیڑے مکوڑے کو مار سکتے ہیں اور اس قسم کی بھول چوک ہو جانے

پر حالت احرام میں کفارہ (صدقہ یا قربانی کی شکل میں) لازم آتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ وید کے اندر مقام بعثت کی جو تعین سنبھل کے لفظ سے کی گئی ہے وہ مکہ مکرمہ ہی ہے۔

نام کی تعیین:

ویدوں میں آپ کو کلکی (دشمنوں کا صفایا کرنے والا) کہا گیا ہے۔ اس کا مفہوم ایک تو یہی ہے جو مذکور ہوا۔ دوسرا مفہوم کھجور یا انار کثرت سے کھانے والا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ "کلکی" جس کی آمد کا انتظار ہندو بھائیوں کو ہے، وہ آپؐ ہی کی ذات گرامی ہے۔ کیونکہ عرب میں کھجور بکثرت ہوتی ہے اور یہی یہاں کے عوام کا کھانا تھا۔ عربوں کی معیشت کا تمام دارومدار حیوانی غذاؤں میں اونٹ کے دودھ، گوشت اور نباتاتی غذاؤں میں جو اور کھجور پر تھا۔ حتیٰ کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس کے گھر میں کھجور نہ ہو، اس گھر کے لوگ بھوکے رہیں گے۔ (ترمذی)

بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے: عَنْ عَائِشَةَ: قَالَتْ تُوُفِّيَ النَّبِيُّ ﷺ وَقَدْ شَبِعْنَا مِنَ الْاَسْوَدَيْنِ اَلتَّمْرَ وَالْمَآءَ (حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، اس وقت ہم کھجور اور پانی سے آسودہ ہوئے) (یعنی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کھجور سے بھی آسودہ نہ ہو سکے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تب آسودگی ہوئی۔)

اگر اس کے دوسرے معنی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بھی یہ بات اس طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے رومن امپائر کا خاتمہ ہو گیا اور ایران کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور یہ دونوں طاقتیں اس دور کی سپر طاقتیں تھیں۔

بشارات:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت نہ صرف کہ پران اور بھاگوت میں ہے بلکہ ویدوں اور اپنیشدوں میں بھی ہے۔ تلسی داس نے سنگرام پران میں تو ذات والا صفات کا

تذکرہ آپ کے ذاتی نام سے کیا ہے۔ اسی طرح ویدوں کے رشیوں نے بھی۔ فرق یہ ہے کہ عربی زبان کا لفظ سنسکرت زبان میں جس میں ح، ج، دنہیں ہے۔ بدقت حذف دال یا سے ادا کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کسی زبان کا اسم ذات دوسری زبان میں کچھ نہ کچھ بدل ضرور جاتا ہے۔ مثلاً ابراہام عربی میں ابراہیم اور ایزک، اسحاق، جیکب یعقوب ہو گیا اور یوحنا کو مٹی سے ادا کیا گیا ہے۔ حق کے متلاشی کے لئے یہ ناموں کی تبدیلی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ ان اوصاف کو تلاش کرتا ہے جس سے اس ذات کا تعارف ہوتا ہے اور حقیقت تک پہونچا جاتا ہے۔

جگت گرو کے مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں پران اور بھاگوت پران کے بیان کردو کل نشانیاں آئینہ کی طرح نظر آتی ہیں، وہ نشانیاں حسب ذیل ہیں۔

کلکی اوتار جگت گرو کے ظہور کے زمانہ میں ہندوستان میں سورج بنسی خاندان آپس میں جھگڑ کر تباہ ہو جائیں گے۔ (ایران وخراسان) کا بادشاہ اپنے اطراف رہنے والے سورج بنسی خاندان کو تباہ کردے گا۔ لہٰذا اسی کے مطابق کلیوگ ۳۶۵۸ سال کے بعد ہندوستان کی زبردست حکومت بے دینی کی وجہ سے تباہ ہوگئی اور گنگا پار تک بلخ کے بادشاہوں کی حکومت ہوگئی اور تقریباً تمام چھتری خاندان تباہ ہوئے۔ (جگت گرو۔ص ۲۴۰)

اتھروید میں بیت اللہ شریف کا تعارف یوں کرایا گیا ہے:

पशसो संपरी व्रनाम
पुर हिरण्यो ब्रहम
विशेशम्मरा जिताम ।।३३।।

روشن آسمانی برکات سے گھری ہوئی بستی کو زندگی بخش ناقابل فتح مقام کیا ابراہیم نے۔ (اتھرن ویدکھانڈ۔۱۰متر۳۳)

سام وید میں آپ کا تذکرہ یوں آیا ہے: ''احمد نے اپنے رب سے پُرحکمت شریعت کو حاصل کیا۔ میں سورج کی طرح اس سے روشن ہورہا ہوں۔ (سام وید پرپھاٹک۔۲۲

دشنی (۲) منتر (۸)۔

اسی طرح ویدوں میں اکثر مقامات پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں بشارت کا ہونا، اس بات کی بھی دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ برصغیر میں بسنے والی قوموں میں بھی قدیم زمانہ میں رہا ہے اور قرآن پاک کی یہ شہادت وَاِنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ (ہر بستی میں کوئی ڈرانے والا آیا ہے) اس پر دال ہے۔

اتوپ اپنیشد میں دو جگہ صاف الفاظ میں محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم لکھا ہوا ہے۔ شرن لیلا امرت۔ صفحہ ۲۰۹ پر صاف لکھا ہے کہ وہ کتاب تقریباً دکن میں شیوا چاری مٹھوں میں موجود ہے۔ ویاس اپنیشد میں ذات احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت کو مہارشی ویاس جی نے اس طرح بیان کیا:

अ	कारो अखं न्हस्य
ह	कारो हननू मिती
म	कारो माया ब्रहनाण्ड
द	कारो दद यंतित

(الف) سے روح اور جان و جسم کی وحدت قائم ہوئی۔ (ح) سے اس کا مالک بن کر جزاء وسزا دینے والا بناء (میم) سے کائنات عالم بناء (دال) سے دینے والا بنا۔ (ویاس اپنشد)

دکن کی سونار قوم جن کی مذہبی کتابوں میں کلمہ طیبہ کے علاوہ اور بہت سے بزرگوں کے نام ہیں اور ہر سونار کھانے سے پیشتر ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر معین الدین کو دوست تیرا ہو دین کہہ کر کھاتے ہیں اور خصوصاً لنگایت کے اکثر مٹھ پنی۔ (مجاور) سبز جھنڈا رکھتے ہیں۔ غرض ہندوؤں کے ویدوں، شاستروں اور پرانوں میں مٹھوں اور تاریخی بت پرستی کا بے ہودہ عمل ہونا کتنی شیریں وسہل زبان میں سمجھایا گیا ہے۔

☆☆☆

ایمانی کردار کے آبگینے

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ وَمُعَاذِ ابْنَ جَبَلٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ: اِتَّقِ اللّٰہَ حَیْثُمَا کُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُھَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ۔ (رواہ الترمذی: رقم ۱۹۸۷)

(ترجمہ) حضرت ابوذر غفاری اور حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم جہاں کہیں رہو اللہ سے ڈرتے رہو، خطا ہو جانے کے بعد نیکی کر لیا کرو، کہ وہ برائی کو مٹا دیتی ہے، اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ۔

اللہ عزوجل نے حضور اکرم ﷺ کو جوامع الکلم کی خصوصیات سے نوازا تھا مختصر الفاظ میں معانی کا دریا موجزن ہوتا تھا، اس خصوصیت میں آپ منفرد تھے، زندگی بے راہ روی کا شکار نہ ہو، صحیح رخ پر قائم رہے، اس کے لئے استحضار ضروری ہے، ہر وقت ہر جگہ اور ہر کام اور ہر معاملہ میں یہ خیال پختہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہم ہیں اور وہ ذات ایسی ہے جس کی نگاہ میں چشم ابرو کے اشارہ بھی شمار کئے جاتے ہیں "یَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ" (وہ نگاہوں کی خیانت اور دلوں کے بھید بھی جانتا ہے)

لہٰذا اس استحضار کے بعد گناہ کا صدور ناممکن ہوگا، اور پاکیزہ زندگی کا حصول آسان تر ہو جائے گا، اسی کو تقویٰ کہا جاتا ہے، تقویٰ الگ سے کوئی عمل نہیں ہے، جس طرح نماز روزہ حج اور زکوٰۃ اعمال ہیں، اس طرح تقویٰ کوئی عمل نہیں بلکہ اعمال کو سپورٹ اور قوت و نیز قبولیت کی راہ تقویٰ کے ذریعہ ملتی ہے، تقویٰ ایک اینٹی وائرس ہے جو ایمان اور اعمال کو وائرس کے اثر سے بچاتا ہے اور دل کو مانجھ کر چمکا دیتا ہے، لہٰذا اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "اِتَّقِ اللّٰہَ حَیْثُمَا کُنْتَ" (جہاں بھی رہو اللہ سے ڈرتے رہو تقویٰ اختیار کرو)

حدیث کا دوسرا جز ہمیں اپنی عملی زندگی میں حوصلہ عطا کرتا ہے، خود کردہ را علاجے نیست کے برعکس ہمیں یہ دعوت دیتا ہے کہ اگر بھول چوک ہو جائے، خطا ہو جائے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کہ اب داغ کیسے دھلے گا، اللہ کے مواخذہ سے ہم کیسے بچیں گے، تو فرمایا گیا کہ برائی یا خطا کے بعد کوئی نیکی کرلیا کرو، وہ گناہ کے اثر کو زائل کردے گا، اللہ عزوجل کا صاف ارشاد ہے "اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ" (نیکیاں برائیوں کو ختم کردیتی ہیں)

حدیث کا تیسرا جز ہمیں اس انسانی وصف پر ابھارتا ہے جو تمام مخلوقات میں مابہ الامتیاز ہے جو حسن انسانی کا جھومر ہے، جس سے اس کی ذات کو صبر و تحمل میسر آتا ہے، وہ اچھے اخلاق ہیں۔ اچھے اخلاق کا حامل جنت کے قریب ہے اور بداخلاق کا ٹھکانہ جہنم بتایا گیا ہے، لہٰذا اپنی زندگی کو اگر ہم آراستہ کرنا چاہتے ہیں اور قرب الٰہی کا فیضان اس میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہئے، اچھے اخلاق کا مطلب یہ ہے کہ جب اخلاق کو متاثر کرنے والی کوئی بات پیش آئے، اس وقت آدمی اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرے۔ حسن اخلاق ہمارے نبی حضرت محمدؐ کی سب سے اہم صفت تھی، قرآن مجید آپ کے بارے میں صاف کہتا ہے "اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" (آپؐ بلند اخلاق کے حامل ہیں) آپ کی زندگی کے جملہ امور و معاملات اور معاشرتی تعلقات میں اس وصف نے کفار و مشرکین کے دلوں کو فتح کیا تھا، اور یہ ایسا ہتھیار تھا کہ جس کے سامنے سخت سے سخت دشمن بھی آپ کا گرویدہ اور شیدائی ہو جاتا تھا، اور پھر اس کے لئے کوئی مفر نہیں رہ جاتا تھا۔

آپ ﷺ کے صحابہ کرام تابعین، تبع تابعین اور سلف صالحین کی زندگیوں میں حسن اخلاق کے ہزاروں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ جن کے ذریعہ ان حضرات نے ملکوں اور قبیلوں کو فتح کرلیا اور اخلاق حسنہ کی سحر انگیزی کے سامنے ان کے دیئے بجھ گئے، اور انہوں نے اسلام کے آغوش میں پناہ لی۔ آج کے معاشرہ و ماحول میں جہاں ہر وقت ہمارا کسی نہ کسی کے ساتھ لین دین ہے، مسلمان ہی نہیں کافر مشرک اور دین بیزار لوگوں سے ہر لمحہ ہمارا رابطہ ہے، اس حسن خلق کے وصف سے ہم دین اسلامی کی ایسی ترجمانی کر سکتے ہیں کہ اس کے سامنے زبان کی روانی اور قلم کی جولانی ہیچ ہے۔

اچھے ناموں کے اثرات سیرت نبویؐ کی روشنی میں

انسانی فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر چیز میں حسن و جمال کو پیش نظر رکھا جائے، اس لئے کہ اللہ عزوجل نے انسان کو بہترین ساخت اور عمدہ شامہ عطا فرمایا ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ" (ہم نے انسان کو عمدہ ساخت میں پیدا کیا ہے)، لہٰذا ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اپنے بچوں کی نگہداشت اور نشو ونما جہاں بہترین انداز میں کرنے کی فکر کریں وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ بچوں کے نام بھی اچھے رکھے جائیں، اچھے نام اچھی علامت کا مظہر ہوتے ہیں، اور اچھا مظہر اللہ عزوجل کو پسندیدہ ہے، ایک صحابی نے حضور کریم سے عرض کیا کہ حضور ﷺ ہمارا جوتا شاندار اور خوبصورت ہو ہمیں یہ پسند ہے یہ کبر میں تو شمار نہیں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، اللہ کی ذات خود آئینہ جمال ہے اور اسے جمال پسند ہے، کبر تو کہتے ہیں کسی کے حق کو حقیر سمجھ کر دبانے اور اپنے کو بڑا سمجھنے کو۔

آج کل عام مزاج یہ بنتا جارہا ہے کہ بچوں کے ناموں میں جدت ہو، ایسا نام رکھا جائے کہ کسی اور کا ویسا نام نہ ہو، خواہ اس کا مفہوم کچھ بھی نکلتا ہو، حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سَمُّوْا بِاَسْمَآءِ الْاَنْبِيَآءِ (ابوداؤد) انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر اپنے بچوں کے نام رکھو، اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے اپنے آخری صاحبزادے کا نام ابراہیم رکھا تھا جو حضرت ماریہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے "تَدْعُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِاَسْمَاءِ كُمْ وَاَسْمَاءِ آبَائِكُمْ فَاَحْسِنُوْا اَسْمَآءَ كُمْ" (مسند احمد) (قیامت کے دن تمہیں اپنے آباء کے نام سے پکارا جائے گا، لہٰذا تم اچھے نام رکھا کرو)، احادیث میں اچھے نام جس سے عبدیت کا اظہار ہو اسے قرار دیا گیا ہے، چنانچہ عبداللہ اور عبدالرحمٰن اللہ کے نزدیک پسندیدہ نام ہیں، حضور اکرم ﷺ اچھے نام رکھنے کا اہتمام

فرماتے تھے بلکہ نام میں اگر معنوی اچھائی نہ ہو یا اس میں شبہ ہو تو اسے بدل دیا کرتے تھے، حضرت زینبؓ بنت ابی سلمہؓ کا نام 'برہ' تھا جس کے معنی نیکوکار ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کا نام اس لئے تبدیل فرمادیا کہ اس میں اپنی تعریف کا پہلو نکلتا ہے، اس کی وجہ سے نفس کہیں دھوکہ نہ دے دے، لہٰذا آپ کا نام زینب رکھا، اسی طرح ایک صحابیؓ کا نام 'حزن' تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کا نام اس لئے بدل دیا کہ اس کے معنی سخت زمین کے ہوتے ہیں، سہل نام رکھ دیا، جس کے معنی نرم ہونے کے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ اچھے ناموں سے شگون لیتے تھے، نام سن کر خوش ہوتے تھے، اور اس کے اچھے اثرات کے متمنی ہوتے تھے صلح حدیبیہ کے موقع پر معاملہ الجھا ہوا تھا، قریش کی جانب سے ثالثی کے لئے جب سہیل آئے تو حضور اکرم ہے نے دریافت فرمایا کہ کون ہیں، بتایا گیا کہ سہیل ہیں، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل نے ہمارے معاملہ کو آسان کردیا، اور پھر انہیں کے ذریعہ صلح حدیبیہ کا تاریخ ساز معاہدہ وجود میں آیا جس کو اللہ عزوجل نے فتح مبین سے تعبیر کیا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ جسے یثرب کہتے تھے اس لئے اس کا نام طابہ اور طیبہ رکھا کیوں کہ اس کے معنی میں جرم وزیادتی اور الزام کا مفہوم پایا جاتا ہے، آپ نے تاکید کی کہ یثرب کو طیبہ خوشگوار عمدہ کہا جائے، مدینہ کے معنی شہر کے آتے ہیں چونکہ یہ مدینۃ الرسول ﷺ ہے اس لئے اس کا نام ہی مدینہ پڑ گیا، اب اگر بغیر کسی اضافت کے مدینہ کہا جائے تو اس سے مراد مدینۃ الرسول طیبہ ہی ہوگا، مدینہ میں بخار کی وبا عام تھی، بڑی شدت کا بخار ہوتا تھا، اکثر آنے والے اس میں مبتلا ہو جاتے تھے، نووارد اس کی زد میں آتے تو وہ جلدی وہاں سے رخصت ہونا چاہتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ کی مشقتیں جھیلنے پر جنت کی بشارت سنائی، اور اس کا نام طیبہ رکھ دیا تو مدینہ کی فضاء اللہ کے فضل سے خوشگوار ہوگئی، اللہ کے رسول ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ کالی کلوٹی عورت مدینہ منورہ سے نکل کر جحفہ جہاں یہودیوں کی آبادی تھی چلی گئی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ وبا تھی جو یہاں سے منتقل ہوگئی، اس لئے بعض شارحین نے یہ لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کو اب یثرب

کہنا صحیح نہیں ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ناموں کے اثر انداز ہونے کے بارے میں اپنی مجلس کے دوران ایک موقع پر فرمایا امام اعظم ابوحنیفہؒ کے پڑوس میں ایک شخص نے جو غالباً رافضی تھا دو خچروں کا نام ابوبکر و عمر رکھا تھا، ایک روز ایک خچر نے لات مار کر اس شخص کا پیٹ پھاڑ دیا، جب امام صاحب کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ یہ وہ خچر ہوگا، جس کا نام اس نے عمر رکھا تھا، اس نام کا یہی اثر ہونا چاہئے تھا، بعد میں اس کی تصدیق بھی ہوگئی کہ وہی خچر تھا، حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ الفاظ اور ناموں میں بھی تاثیر رکھی گئی ہے، ایک لڑکے کا نام والدین نے کلیم اللہ رکھا وہ اکثر بیمار رہتا تھا، فرمایا کہ میں نے اس کا نام بدل کر سلیم اللہ رکھ دیا، اس وقت سے تندرست رہنے لگا۔ (مجالس حکیم الامت ص ۱۶۵)

نام رکھنے میں غلو کی حد تک یکساں ہوا اس کا خیال رکھا جاتا ہے یعنی سارے بچوں اور بچیوں کے نام ہم وزن ہوں، حالانکہ ناموں کے سلسلہ میں یہ التزام غیر ضروری ہے، کبھی کبھی اس کی پابندی بھونڈی معنویت پیدا کر دیتی ہے، ایک صاحب کے چند لڑکے تھے، ایک کا نام شمیم تھا، دوسرے کا نام نعیم تھا، تیسرے کا نام کریم تھا، چوتھا بچہ پیدا ہوا تو انہیں یہ سودا سمایا کہ اس بچے کا نام قرآن پاک سے اسی وزن پر رکھیں گے، چنانچہ تلاش بسیار کے بعد انہیں سورۃ القلم میں زنیم لفظ مل گیا، انہوں نے بغیر معنی پر غور کیے اپنے بچے کا نام زنیم رکھ دیا، کچھ دنوں کے بعد ان کے یہاں کوئی صاحب علم مہمان ہوئے، انہوں نے میزبان کو اپنے لاڈلے بچے کو زنیم کہہ کر پکارتے ہوئے سنا، اس پر انہیں بڑا تعجب ہوا کہ باپ نے اپنے بیٹے کو خود زنیم کہا تعجب کی بات ہے، لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس بچے کا نام ہی زنیم ہے، چنانچہ انہوں نے دریافت کیا کہ آخر آپ نے یہ نام کیوں رکھا ہے، انہوں نے بڑی مسرت کے ساتھ فرمایا کہ اصل میں میں نے اپنے اس بچے کے نام کے تعلق سے یہ سوچا کہ اپنے دیگر بچوں کے ناموں پر ہم وزن ہو لیکن خواہش یہ تھی کہ وہ نام قرآن پاک سے ماخوذ ہو، بڑی تلاش کے بعد الحمدللہ یہ نام سورۃ القلم میں مجھے مل گیا اور میں نے یہ نام رکھ دیا، مہمان نے کہا ابلیس اور ابولہب، فرعون بھی تو قرآن پاک میں ہیں، کہا یہ نام کوئی

رکھنا پسند کرے گا، بالآخر جب قرآن پاک میں اس کا معنی دیکھا گیا تو زنیم کے معنی حرام زادے کے تھے، مہمان نے کہا کہ کیا کوئی یہ سننا بھی پسند کرسکتا ہے، میزبان کو بڑی پشیمانی ہوئی اور اس بچے کا نام بدل دیا گیا، یہ غلطیاں آج ہورہی ہیں جس سے ہماری تہذیب متاثر ہورہی ہے، اس طرح ہم اپنے بچوں کے ناموں میں بھی ان کی تقلید کرتے جارہے ہیں، اس سے ہمیں پرہیز کرنا چاہئے، بچوں کے حقوق میں سے یہ ہے کہ ان کا نام اچھا رکھا جائے، اور اچھے نام کو بلاتے وقت بھی ملحوظ رکھا جائے، اسی طرح نام بگاڑنا بھی گناہ کی بات ہے، قرآن پاک میں اسے بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقَ کہا گیا ہے، لہٰذا کسی کے نام کو بگاڑ کر پکارنا نہیں چاہئے، اس میں خود گھر والوں کی طرف سے کوتاہی ہوتی ہے، وہ پیار میں مخفف کرتے ہیں اور پھر وہی نام بن جاتا ہے، اس سے پرہیز لازم ہے۔

حضرت مولانا ابواللیث صاحب ندویؒ جو جماعت اسلامی کے امیر ہوئے، ندوے کے فاضل اور علامہ سید سلیمان ندوی کے شاگرد تھے، ان کا نام شیر محمد تھا، استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان کا نام بدل کر ابواللیث رکھا، ہر چند لیث کے معنی بھی شیر کے ہیں لیکن اس میں حسن ہے جو پسندیدہ ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی کا نام اصرم تھا جس کے معنی کاٹنے کے آتے ہیں، اللہ کے رسول نے فرمایا تمہارا نام اصرم نہیں بلکہ زرعۃ ہوگیا جس کے معنی کھیتی اور جو کے ہوتے ہیں، بعد میں وہ صحابی اس نام سے معروف ہوئے لہٰذا ہمیں اچھے ناموں کا التزام کرنا چاہئے۔

☆☆☆

اور ایک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

وادی بطحاء کے کوہستانی علاقہ میں جبل نور کو یہ ممتاز مقام حاصل ہے کہ اس کی چوٹی پر وہ مخروطی شکل کا غار ہے جسے غار حراء کہا جاتا ہے، جو امین ہے اس نور نبوت کا جس کا ظہور صدیوں کے بعد پہلی دفعہ ہوا، اس پاک، برگزیدہ فرشتہ کی آمد کا، اس کی اس صدائے دلنواز کا جس نے قوموں کی زندگی اور ان کی روح کو قوت و طاقت کے ساتھ بالیدگی بھی عطا کی، اس نغمہ ربانی کا جس کے ساز پر مضراب یقین کی شہنائی بجنے لگتی ہے، یاس و ہراس کی اس کھائیوں سے گذر کر کیف و نشاط، سرور و انبساط اور عزم و یقین کے ساحل مراد پر پہنچا جا سکتا ہے۔

اس پیغام ربانی کا جو عصائے موسیٰ، ید بیضاء اور دم عیسیٰ کی تنویر کا عکاس ہی نہیں بلکہ شب دیجور کی تمام تر ظلمتوں کے ازالے کے لئے بصائر کی فروزاں قندیلوں کے ساتھ ابدی معجزانہ کردار کا حامل ہے۔

وہ حراء آج بھی اپنے کردار و پیغام کے ساتھ قائم ہے، صدیاں گذر گئیں، لیکن اس کے کسی حصہ میں کوئی فرق نہیں آیا، گردش دوراں نے عارض گیتی پر نہ جانے کتنے انقلاب پیدا کیے لیکن غار حراء کی بازگشت تعطل آشنا زندگی کے لئے پیغام کیف و نشاط لئے آج بھی حاضر ہے۔

وہ حراء جو آفتاب نبوت کی کرنوں کا امین ہے، جس کی خلوت میں ہادی عالم نے ایک عرصہ گزارا ہے، اور جس کی ضیا بار کرنوں نے عرب و عجم کو یکساں طور پر روشنی بخشی ہے، آج ضرورت ہے کہ اس تنویر کو ظلمت گہہ آب و گل کے ہر حصہ میں پوری قوت کے ساتھ پہنچانے کی کوشش کی جائے تا کہ سپہرہ زیست کو قوس قزح کا حسن و تجمل حاصل ہو، اور بلکتی

سسکتی کڑھتی اور بے نیل ومرام ہر طرف گرتی، الجھتی ہوئی انسانیت کو راحت واطمینان اور قرار وسکون کی دولت میسر آئے۔

حضور ﷺ پر پہلی وحی اس غار حراء میں نازل ہوئی تھی، جس نے انسانوں کو جہل وضلالت کی کھائیوں سے نکلنے پر اکسایا تھا، اور انہیں وہ بھولا ہوا سبق پڑھایا تھا، جس سے انسانی زندگی کے سارے پیچیدہ مسائل حل کیے جاسکتے ہیں، اللہ کا فرشتہ حراء کی تنہائی میں آپ ﷺ کے پاس جو ربانی سوغات لے کر آیا وہ علم تھا، معرفت کی تنویر تھی، آگہی کا مشعل تھا، خودشناسی کے ساتھ خداشناسی کا جوہر تھا، اور واقفیت کی قندیل تھی، بلکہ حقیقت میں وہ شمع حیات تھی جس سے ظلمتیں کافور ہوجاتی ہیں۔

اہل مکہ کو زندگی کی شاہراہ میں بہت سے چیلنجوں کا سامنا تھا، وہاں غریب ومفلس بھی تھے، فاقہ مست ودریدہ پیرہن بھی، داغ یتیمی لیے ہوئے یتیموں کے ٹوٹے ہوئے دل اور ماتم کناں بیوائیں بھی، روٹی کپڑا اور مکان کی قلت کا رونا بھی تھا، پانی کی عدم فراہمی اور کمیابی کا شکوہ بھی، الغرض وہ ساری چنوتیاں موجود تھیں جو کسی زندہ معاشرہ کو پیش آسکتی ہیں، ایسے وقت میں پہلی دفعہ آسمان کا زمین سے رشتہ وحی الٰہی کے ذریعہ قائم ہورہا ہے، اور تمام چنوتیوں کے زہر کا تریاق ان پانچ آیتوں کو قرار دیا جاتا ہے، جن میں رب کائنات نے پڑھنے کا حکم دیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

"اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ"

(العلق)

(پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے، جس نے انسان کو جمے ہوئے لہو سے پیدا کیا ہے، پڑھو! تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے تعلیم دی، انسان کو اس بات کی تعلیم دی جس سے وہ واقف نہ تھا)۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ نے اس موقع پر لکھا

ہے:

''ایک عجب بات جو دنیا کے فلاسفہ و مفکرین اور مذہب و ثقافت کے مؤرخین کی توجہ چاہتی ہے، وہ اس پہلی وحی میں قلم کا تذکرہ ہے جو ایک امی پر، ایک امی قوم میں اور ایک ایسے ملک میں نازل ہوئی جہاں قلم کا وجود بھی کمیاب تھا اور جہاں پڑھے لکھے افراد انگلیوں پر گنے جاتے تھے، اس نے اس مذہب اور اس مذہب کی حامل امت کو قرآت و کتابت اور قلم سے کام لینے کی صلاحیت اور اس سے اس کے مضبوط ربط و تعلق کی (دوسرے سابقہ مذاہب کے برخلاف) نشان دہی کر دی، جو اس کی عالمی علمی و تصنیفی تحریک کا رمز تھا، جس کی اقوام و ملل کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی، وہ رمز آیت عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ کا اس وحی میں شامل ہونا تھا، جو طلب علم، ذوق، جستجو، اور نئی معلومات کی تلاش اور پچھلے زمانوں میں دریافت نہ ہو سکنے والے مگر ثابت شدہ علمی حقائق کے عدم انکار کا محرک ثابت ہوا۔''

اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس امت کی اٹھان علم پر ہوئی تھی، اور اس میں یہ بھی نکتہ پوشیدہ تھا کہ اب آنے والا زمانہ علم کے چیلنجوں کا ہوگا، جس کے ہاتھ میں علم کا جھنڈا ہوگا وہی قیادت و سیادت کے منصب پر فائز ہوگا، حضور اکرم ﷺ نے ہجرت کے بعد اسی لئے سات ایسی مسجدوں میں تعلیم کا نظم کرایا جو سن ۲ ھ تک مدینہ منورہ میں تعمیر ہو گئی تھیں، اور بچوں کی تعلیم کے ساتھ تعلیم بالغان کا بھی نظام مرتب فرمایا تھا، پڑھانے والے مکہ مکرمہ کے وہ قیدی تھی جو غزوہ بدر کے موقع پر قیدی بنا کر لائے گئے تھے اور وہ ابھی تک مشرک تھے لیکن تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر حضور ﷺ نے انہیں سے کام لیا، اور دس افراد کو لکھنا پڑھنا سکھا دینا ان کے لئے فدیہ قرار دیا، اور مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)

علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: مَنْ مَّاتَ وَھُوَ یَطْلُبُ الْعِلْمَ لَقِیَ اللّٰہَ وَلَمْ یَکُنْ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ النَّبِیِّیْنَ اِلَّا دَرَجَۃُ النُّبُوَّۃِ (جس کی

وفات اس حال میں ہوئی کہ وہ علم حاصل کر رہا ہو، تو وہ اللہ سے اس طور پر ملے گا کہ اس کے اور انبیاء علیہم السلام کے درمیان صرف نبوت کے درجہ کا فرق ہوگا)

آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: "مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيقًا فِي الْجَنَّةِ" (جو علم کی راہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کے لئے جنت کی راہ آسان فرمادیں گے)۔

ہمارے اسلاف نے علم کی راہ کو اختیار کیا، قرآن پاک کو دستور زندگی اور احادیث نبویہ کو زندگی کی تشکیل کا اہم محرک سمجھتے ہوئے اس کے فروغ واشاعت میں لگے رہے، علم کی نکہت انہیں ریگزاروں سے سمن زاروں تک پہنچاتی رہی، بالآخر علمی انہماک اور ذوق وجستجو نے انہیں ہم دوش ثریا بنادیا۔

آج ضرورت ہے کہ ہم انسانی معاشرہ میں "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ" کی قندیل فروزاں لے کر جائیں اور اسے وثنیت کے دلدل اور اصنام پرستی کے زہر ہلاہل سے نجات دلائیں، سچائی، نیکی اور عمل کی راہوں پر اس کو ڈال دیں۔

آج ہندوستان کی سرزمین میں ہم مسلمانوں کو بہت سے چیلنجوں کا سامنا ہے لیکن سب سے اہم اور قابل توجہ چیز صحیح علم کا عام کرنا ہے، مکاتب ومدارس کے ساتھ عصری دانش گاہوں کے قیام کے پہلو بہ پہلو صالح لٹریچر کی اشاعت وقت کا اہم تقاضہ ہے، یہ وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعہ ہم معاشرہ کے اندرون تک حراء کے افق سے اٹھنے والی صدا اور اس کے پیغام کا رنگ وآہنگ پیش کر سکتے ہیں۔

زبان کی حفاظت لازم ہے

عَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ الْمُزَنِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَتَکَلَّمُ بِالْکَلِمَۃِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰہِ مَا کَانَ اَنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ یَکْتُبُ اللّٰہُ لَہٗ بِھَا رِضْوَانَہٗ اِلَی الْیَوْمِ یَلْقَاہُ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَتَکَلَّمُ بِالْکَلِمَۃِ مِنْ سَخَطِ اللّٰہِ اَنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ یَکْتُبُ اللّٰہُ لَہٗ بِھَا سَخَطَہٗ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَاہ۔ (الحدیث)

(بلال بن حارثؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کبھی آدمی اللہ کی خوشنودی کی ایسی بات زبان سے نکال دیتا ہے جس کے بارے میں اُسے گمان تک نہیں ہوتا کہ بلند درجے تک پہنچ جائے گی، اللہ تعالیٰ اُس کے لئے قیامت کے دن اپنی خوشنودی لکھ دیتا ہے۔ اور کبھی آدمی اللہ کی ناراضگی کی ایسی بات زبان سے نکال دیتا ہے جس کے بارے میں اُسے گمان تک نہیں ہوتا کہ انتہائی نچلے درجہ کی ہوگی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے لئے اس بات کی وجہ سے ناراضگی لکھ دیتا ہے۔)

انسان کو اللہ عزوجل نے صاحب زبان بنایا ہے، اس زبان کو استعمال کی اسے قدرت دی ہے اس کو وہ صحیح اور غلط دونوں طرح استعمال کرسکتا ہے، لیکن اسے یہ اس حدیث کے ذریعہ باور کرایا گیا ہے کہ اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اس کی زندگی کو کس حد تک متاثر کرسکتے ہیں۔ بسا اوقات معمولی بات جو اللہ کو پسند آگئی تو اس کا درجہ قیامت کے دن بلند کرنے کا ذریعہ ہوگی، اور رضائے الٰہی اور خوشنودی کا ذریعہ ہوگی، اور بہت چھوٹی بات

لیکن وہ اللہ کو ناراض کرنے والی ہو تو اس کی حیثیت کو گرا دے گی اور قیامت کے دن اللہ کے غضب کا باعث ہوگی۔

اس لئے زبان کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے، ایک ایک لفظ اللہ عزوجل کے یہاں کاؤنٹ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ۔۔۔۔ (ق) (بات جو زبان پر آتی ہے اس کی حفاظت ہوتی ہے)۔ اس کے اثرات اور اکتسابات کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے روزانہ زبان کے حضور میں سارے اعضائے انسانی دست بستہ پیش ہوتے ہیں اور عرض گذار ہوتے ہیں کہ تو اگر ٹھیک رہے گی تو ہم سب کی خیریت۔ اس لئے کہ زبان کی غلطی کا خمیازہ جسم کے دیگر اعضاء کو اٹھانا پڑتا ہے۔ زبان تو اپنے باڈی گارڈوں کے حصار میں رہتے ہوئے محفوظ رہتی ہے۔

نطق یعنی بامفہوم بولنا انسانی زندگی کا امتیاز ہے۔ ساری مخلوق میں یہ وصف صرف اور صرف انسان کو حاصل ہے۔ اس لئے اس کو بڑا محتاط رہنا چاہئے۔ ایک دوسری حدیث میں یہ مضمون بھی آیا ہے کہ جو شخص بھی اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو اُسے چاہئے کہ یا تو اچھی بات کہے یا چپ رہے۔ دراصل زبان سے جو الفاظ ادا ہوتے ہیں ان کے پیچھے انسان کا ایمان، اس کے جذبات و احساسات اور اُس کی پوری شخصیت ہوا کرتی ہے۔ زبان اُن سب کا مظہر ہے۔ لہٰذا ہمیں ہنسی مذاق میں دلداری کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ دلآزاری سے پرہیز کرنا چاہئے۔

☆☆☆

الوالعزمی کی ایک مثال

انسان کو اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات میں عزم و ہمت الوالعزمی، جوانمردی، طالع آزمائی اور مشکلات و مصائب میں اپنی راہ بنانے اور مقصد کی یافت میں جان و دل کی بازی لگانے کے بہتر سلیقہ سے نوازا ہے۔

وہ خاردار جھاڑیوں میں اپنی راہ بنا لیتا ہے اور ماحول کی برہمی اور حالات کی ناسازگاری اس کی راہ میں سد آہن بننے سے قاصر نظر آتے ہیں بلکہ وہ اس جذبہ کے فروغ کے لئے زیر لب یہ نغمہ گنگناتے ہوئے اپنے اندر اقدام کی صلاحیت بڑھاتا رہتا ہے۔

آغشتۂ ایم ہر سرے خارِ بخونِ دل
قانون باغبانیٔ صحراء نوشتہ ایم

ہندوستان کے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں، خصوصاً اقلیتوں کے سلسلہ میں حکومت کا جو رویہ ہے وہ اظہر من الشمس ہے، لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے کام کرتے رہنا چاہئے۔ مایوسی کے بطن سے نامرادیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں ہمیں ایسے اشخاص کی زندگی سے درس لینا چاہئے جو حالات کی سنگینی کا شکوہ نہیں کرتے بلکہ اپنی راہ وہ خود بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اسی قسم کی مثال ام الخیر کی ہمارے سامنے ہے۔ ام الخیر جو آج آئی۔ اے۔ ایس۔ کے عہدے پر فائز ہے، اس کی داستاں زندگی کے اوراق پڑھئے اور ہمت مرداں مدد خدا کی تصویر کا مشاہدہ کیجئے۔

معاصر جریدے رفیق منزل نے اپنے اگست کے شمارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ چشم کشا ہے:

''گذشتہ ماہ جب UPSC کے نتائج سامنے آئے تو جہاں پر کامیاب مسلم طلباء

وطالبات کی اچھی تعداد سرخیوں کی زینت بنی وہیں دوسری طرف JNU کی ایک مسلم طالبہ ام الخیر کا نام بھی سوشل میڈیا پر چھایا رہا۔ ملک کے سب سے باوقار امتحان UPSC میں ام الخیر کی یہ کہانی دہلی کی جواہر لال یونیورسٹی سے ہوتی ہوئی سیول سروس امتحان میں کامیابی تک جاتی ہے۔ راجستھان کے گاؤں بالی میں بچپن گزارنے والی ام الخیر غریبی اور تنگ دستی کے ماحول میں اپنا یہ سفر طے کیا ہے۔ وہ بتاتی ہے جب اس کے گھرانے کے لوگ راجستھان سے دہلی شفٹ ہوئے تو حضرت نظام الدین کے پاس ایک جھگی جھوپڑی میں رہنے لگے، جس میں بارش کے زمانے میں پانی ٹپکنے لگتا تھا۔ یہ معاشی مسئلہ اس وقت شدید ہوگیا جب وہ آٹھویں کلاس میں تھی تو گھر والوں نے اسے تعلیم کو جاری رکھنے کی وجہ سے معاشی سہارا دینے سے انکار کردیا۔ ان حالات سے نمٹنے کے لئے ام الخیر نے آٹھویں کلاس سے ہی بچوں کو گھر پر ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ ۶ تا ۸ گھنٹے 50 روپئے فی کس ٹیوشن پڑھا کر اپنا خرچ نکالتی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ تعلیم میں بہتر کارکردگی کے نتیجے میں اُسے چیریٹبل ٹرسٹ کی جانب سے میرٹ کی بنیاد پر اسکالرشپ دیا گیا، جس کے ذریعہ وہ آگے کی تعلیم کو جاری رکھ سکی، اس طرح ام الخیر نے غربت معاشی خستہ حالی تنگ دستی کو اپنے مقصد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔''

ام الخیر کی اس کہانی کا دردناک پہلو یہ بھی رہا کہ ام الخیر کو اپنے سماج و خاندان سے اخلاقی ہمدردی بھی حاصل نہ ہوسکی وہ ایسے سماج میں پلی بڑھی جہاں لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ام الخیر کی والدہ ۲۰۰۳ء میں جب فوت ہوگئیں اُس وقت وہ آٹھویں کلاس میں تھی۔ ۲۰۰۴ء میں ام الخیر نے اپنی سوتیلی ماں کے گھر کو اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ تعلیم ترک کرنے پر اصرار کررہے تھے۔ اس نے کرایہ کا مکان لیا اور ٹیوشن پڑھا کر اپنی ضرورت پوری کرنے لگی اور تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس طرح ام الخیر نے سماج و خاندان کے نفسیاتی، اخلاقی سہارے کے بغیر ہی اپنا راستہ طے کیا۔

ام الخیر نے غریبی، خاندان کی سرپرستی سے محرومی، غیر تعلیمی پسماندہ ماحول کی گھٹن کے ساتھ ایک بڑے چیلنج کا بڑی دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ وہ تھا جسمانی بیماریوں کا وہ

سلسلہ جس میں ہڈیاں کمزور ہو کر سکڑنے لگتی ہیں۔ وہ اس بیماری میں مبتلا بھی تھی اور اس کا قد بھی دن بہ دن کم ہوتا جا رہا تھا۔ ام الخیر ۷ ارفریکچر سے متاثر بھی تھی۔ اب تک ۷ سرجری ہو بھی چکے ہیں۔ ان تمام چیلنجوں کے باوجود وہ UPSC کے لئے منتخب قرار پائی۔ ہم اسے اس کے جذبہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اپنی نوجوان نسل کو اس سے سبق حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ حالات کی ستم ظریفیوں کا رونا رونا یہ بزدلی کی بات ہے، ام الخیر کی یہ داستان ایسے نوجوانوں سے شاکی ہے؟ اس کا طرۂ امتیاز یہ ہے۔

مجھے واللہ اُن سے ہے شکایت
جسے ہر آن ڈر ہے اور میں ہوں

☆☆☆

کلام رسول ادبی بلاغت کا شاہ کار

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اپنے اندر ایک ایسا اثر انگیز ادبی مواد رکھتا ہے جس میں طاقت ور انسانی جذبہ اور رقیق انسانی تأثر کی تصویر کشی اور ادبی رعنائی و برنائی پائی جاتی ہے اور جذبۂ تأثر کے یہ نقوش خاص طور پر آپ ﷺ کی ان احادیث اور کلام میں زیادہ نمایاں ہیں جو فطری انسانی جذبات اور نفسیاتی حالات و کیفیات پر مشتمل ہے۔

یہ ادیبانہ طرز اور مؤثر و دلکش اسلوب ادبی دائرے میں بحث و نظر کے مستحق ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فنی خصائص کے ذریعہ ان شریفانہ اغراض و مقاصد کی بھی خدمت کرتے ہیں جن کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی دنیا میں بعثت ہوئی، یعنی دعوت و تربیت اور ان سے تعلق امور میں بھی ان سے بڑی مدد ملتی ہے اسی لیے ادب نبوی کا یہ پہلو اس کا مستحق ہے کہ کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے دلچسپی رکھنے والے، محققین خاص طور سے اس کی طرف توجہ کریں اور اس میں دلچسپی لیں، کیونکہ یہ زندگی کے ایک اہم پہلو کی نمائندگی کرتا اور اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اس پہلو کے بعض حصے اپنے پرائیویٹ اور نجی واقعات سے متعلق آپ ﷺ کے اظہار خیال کے موقع پر اور آپ ﷺ کے ساتھ پیش آنے والے مخصوص نفسیاتی فطرت کے حامل معاملات میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ مؤثر اور والہانہ انداز میں آپ ﷺ کی دعاؤں میں نمایاں ہیں۔

جہاں تک اجتماعی و معاشرتی مواقع کی بات ہے، جو بعض وقت جذباتی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں تو آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں لوگوں کے ساتھ آپ ﷺ کے اظہار رائے و اظہار تأثر کے مواقع پر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں ملتی ہے، جو آپ ﷺ نے وفد عبدالقیس کی آمد کے موقع پر فرمایا تھا، عبدالقیس ربیعہ کا ایک قبیلہ ہے اور قبیلہ ربیعہ کے اور آپ ﷺ کے قبیلہ مضر کے درمیان کشمکش اور چشمک مشہور و معروف رہی ہے اس چشمک کی موجودگی میں اس بات کا پورا احتمال تھا، کہ ارکان وفد کے دلوں میں (اگر ان کے ساتھ توجہ میں کمی، استقبال میں رواروی سے کام لیا گیا تو) آزردگی پیدا ہو جائے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیفیت و نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا تدارک فرمایا، اور وفد کا استقبال ایسے جملہ سے کیا جو اس صورتحال سے اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکے، آپ ﷺ نے فرمایا: "مرحباً بالقوم غیر خزایا و لا ندامی" (آیئے آپ لوگ آپ کو خوش آمدید ہے، آپ کو یہاں آ کر نہ ناقدری کا احساس ہوگا نہ کمتری کا اور نہ آپ کو یہاں آ کر کوئی افسوس ہوگا)، اس طرح آپ ﷺ نے ارکان وفد کے قلوب میں یہ اطمینان و اعتماد پیدا کیا کہ وہ معزز اور محترم ہیں ان کی آمد دوسروں کے لیے باعث مسرت ہے، ایسا نہیں ہے جیسا کہ پہلے تھا کہ غیر ہونے کے باعث کوئی توجہ ہمدردی نہیں ملتی تھی۔

لہٰذا وہ اپنے آپ کو پردیسی اور دیار غیر میں تازہ وارد نہ سمجھیں، اور مغایرت و بے توجہی کا احساس نہ کریں، جس کا اہل عرب کے ایک کیمپ والے دوسرے کیمپ میں جا کر احساس کرتے تھے، ان کے لیے ایسا بھی نہیں کہ بعد میں وہ نادم ہوں کہ وہ ایسے شخص کے پاس گئے جس نے ان کا اکرام و احترام نہیں کیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عزت و طاقت کی ایسی پوزیشن میں تھے کہ آپ ان کے لیے صرف معمولی اہتمام ظاہر کرنے پر اکتفا فرما سکتے تھے اور کسی ایسے شخص یا وفد کی طرف سے جو آپ ﷺ سے لینے اور فائدہ اٹھانے کے لیے آ رہا ہو، غیر معمولی حساسیت کی کوئی پرواہ نہ کرتے، کیونکہ وہ لوگ طالب تھے اور آپ مطلوب، وہ طلب و سوال کی پوزیشن میں تھے اور آپ عطاء و بخشش کے مقام پر فائز تھے۔

ایک دوسری مثال بزرگ ایرانی صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے لیے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "سلمان منا اهل البیت" (سلمان

ہم میں سے ہیں جیسے گھر کے افراد ہوتے ہیں)۔ یہ جملہ اپنے اندر جہاں مکارم اخلاق کا ایک خوبصورت اور حسین مفہوم رکھتا ہے، وہیں دوسری جانب ایسی لفظی تعبیر پر مشتمل ہے جس سے اطمینان واعتماد کا اشارہ ملتا ہے وہ لفظی تعبیر خاص طور پر "منا اهل البیت" کا کلمہ ہے اور پورا جملہ ادب نبویؐ کا شاہکار ہے۔ نیز اس جذباتی کیفیت سے بھی متعلق ہے۔ جو ان جیسے حالات میں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوسکتی ہے، کیوں کہ حضرت سلمانؓ عرب نہ تھے، بلکہ ایرانی تھے اور ایرانیوں اور عربوں کے درمیان نسلی تعصب بڑھا ہوا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں نازک نفسیاتی جذبہ وکیفیت کی ایک مثال ہم اس وقت پاتے ہیں جب آپؐ اپنے محبوب چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے صدمہ سے دوچار ہوتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے چچا حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے ساتھ ایسا تعلق تھا، جس میں خاندانی وحدت وقرب سنی کا تعلق اور چچا بھتیجے کی محبت نے جذباتی ارتباط وہم آہنگی پیدا کردی تھی، ایک طرف تو وہ آپ ﷺ کے دودھ شریک اور ہم عمر تھے تو دوسری طرف آپ ﷺ کے مشفق چچا تھے آپ ﷺ کے ساتھ ان کی محبت وشفقت کا یہ عالم تھا۔ کہ انہوں نے جب یہ سنا کہ ابوجہل نے برسرعام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آزاری کی ہے آپ ﷺ کو ایذا پہنچائی ہے، اور سخت وسست کہا ہے، تو انہیں سخت طیش آیا اور ان کا جوشِ غضب اپنی انتہا کو پہنچ گیا، اور انہوں نے عزیز ترین بھتیجے کا انتقام لینے کے لئے ابوجہل کے ساتھ نہایت درشت معاملہ کیا اور ایسی چوٹ لگائی کہ اسے زخمی کردیا اور بھتیجے سے اپنا تعلق ثابت کرنے کے لئے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا اعلان کردیا، پھر اس کو نبھایا اور تاحیات اسلام اور پیغمبر اسلام کے لئے سینہ سپر رہے اور اپنی جواں مردی وشجاعت سے آپ ﷺ کی مدد کرتے رہے۔ حضرت حمزہ قریش کے ممتاز اور بہادر ترین نوجوانوں میں سے ایک تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے تعلق کی وجہ سے ان سے محبت فرماتے تھے، اور ان کو اپنا قوت بازو، سہارا، حامی و مددگار اور رفیق وانیس پاتے تھے۔

یہی عظیم ومحبوب چچا غزوہ احد میں اسلام کے لئے کارہائے نمایاں انجام دینے

کے بعد جام شہادت نوش کرتے ہیں۔ دشمن ان کے جسم کی کاٹ پیٹ کر دیتا ہے۔ ان کی نعش کے ساتھ اہانت کا معاملہ کرتا ہے اور ان کی شکل وصورت بگاڑ دیتا ہے، اب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حادثہ کا کتنا برا اثر ہوا ہوگا، اور آپ ﷺ کے قلب اطہر کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی؟ جب کہ رقت ونرمی اور شفقت ومحبت آپ ﷺ کے خمیر میں شامل تھی۔ اور یہ موقع آپ ﷺ کی تکلیف اور احساس رنج کے اعتبار سے سخت ترین موقعوں میں سے تھا۔

ابن ہشام کہتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس دردناک واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی تلاش میں نکلے، چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں برساتی نالہ (وادی) کے اندر اس حال میں پایا کہ ان کا پیٹ چاک کر کے جگر نکال لیا گیا تھا، اور ان کی لاش کا مثلہ کر دیا گیا تھا، بایں طور کہ ان کی ناک اور دونوں کان کاٹ دیئے گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت حمزہؓ کی لاش پر پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا: میرے لئے اس حادثہ سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت نہیں۔ میرے دل کو تکلیف وغصہ اتنا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا، نیز یہ بھی فرمایا کہ اگر مجھے اپنی پھوپھی (حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا) کا خیال نہ ہوتا کہ اس بات سے انہیں رنج ہوگا۔ اور میرے بعد یہ چیز سنت بن جائے گی۔ تو میں انہیں (حمزہؓ کو) یوں ہی بے گور وکفن چھوڑ دیتا، یہاں تک کہ انہیں درندو پرند کھا لیتے، اور اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی بھی لڑائی میں قریش پر غلبہ عطا فرمایا تو میں ان کے تیئیں آدمیوں سے بدلہ لوں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت تأثر کی وجہ سے یہ بات ارشاد فرمائی تھی۔ لیکن چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے معاملہ انتقام کے خلاف تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس پر عمل نہیں فرمایا، صرف اپنے الفاظ میں مقدار تأثر کا اظہار کیا تھا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر (غزوہ احد میں فتح وکامرانی حاصل کر لینے کے بعد) بنی الاشہل سے تعلق رکھنے والے قبیلہ انصار کے گھروں میں سے ایک گھر پر ہوا، اور وہاں آپ ﷺ نے نوحہ کرنے والیوں کا اپنے مقتولین پر گریہ وبکا اور نوحہ سنا تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی چشمہائے مبارک اشک آلود ہو گئیں۔

اور آپ رو پڑے، پھر آپ ﷺ نے درد بھرے لہجہ میں فرمایا: "لکن حمزة لا بواکی لہٗ" (لیکن حمزہ کے لئے رونے والے نہیں ہیں) چونکہ مہاجرین اپنے اپنے خاندانوں کے افراد مکہ میں چھوڑ کر آئے تھے، لہٰذا مدینہ میں ان کے افراد خاندان گنے چنے تھے پردیس میں وطن جیسے اہل قرابت کی ہمدردی کہاں ہو سکتی ہے؟ چنانچہ حضرت حمزہؓ کے اہل خاندان بھی کم تھے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کے لئے غریب الوطنی کا اندازہ دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا، سوچنے کی بات ہے کہ رنج والم کے جذبات سے پر یہ الفاظ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے، حالانکہ آپ ﷺ نبی ہیں اور بشریت کی لغزش کلامی اور خلاف اولیٰ باتوں سے پاک ہیں لیکن خوں چکاں مصیبت کے احساس نے آپ کو بے تاب کر دیا۔ اس جملہ سے آپ کے رنجیدہ اور زخمی قلب کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ ادھر انصار کو رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے احساس رنج اور آپ ﷺ کے ارشاد گرامی کہ "لکن حمزة لا بواکی لہٗ" کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی عورتوں کو حکم دیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم کی طرف نسبت کر کے اظہار غم کریں۔ بس پھر کیا تھا، ہر طرف حضرت حمزہؓ کے نام سے اظہار غم ہونے لگا۔ اور نالہ وغم کے الفاظ بلند ہوئے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان عورتوں کے مسجد کے دروازہ پر پہنچ کر حضرت حمزہؓ کی شہادت پر اظہار غم کرتے سنا تو فرمایا: ''اللہ تعالیٰ انصار پر رحم فرمائے۔ انھوں نے غم خواری میں دیر نہیں کی عورتوں سے کہو کہ واپس چلی جائیں۔''

اور ابن کثیر کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے عورتوں سے فرمایا: ''تم لوگ واپس جاؤ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے، اللہ تعالیٰ کی تم پر رحمت ہو، تم نے اپنی طرف سے غم خواری کا حق ادا کر دیا۔'' اور جس کی چند مثالیں ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے بطور آپ کی نظروں سے گزریں۔

جو شخص کلام نبویؐ پر اس حیثیت سے نظر ڈالتا ہے وہ اس میں مختلف مؤثر نمونے اور بہت سے ایسے نفسیاتی پرتو پاتا ہے جن سے ایک ایسے انسان کی تصویر کشائی ہوتی ہے جو اپنی

انسانی زندگی کے ہر ناحیہ میں سچا اور امانت دار، اس میں ایک نبی کی بلندی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی و رسالت سے سرفراز فرمایا ہے، ایک ایسے انسان کی رقت و نرمی ہے جس نے سب کے ساتھ محبت، سب کے ساتھ سچائی اور سب کے لئے طلب خیر کے جذبہ پر نشو نما پائی ہو، ایک ایسے انسان کی سادگی ہے جو اپنے اہل و عیال اور متعلقین کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، اور ایک ایسے رسول کی عالی حوصلگی اور بلند ہمتی ہے جس نے اپنے پیغام پہنچانے اور اپنی امانت ادا کرنے کا پختہ عزم کر رکھا ہو، چنانچہ نہ وہ اُکتاتا ہے، نہ تھکتا ہے، نہ بحث و مباحثہ کرتا ہے اور نہ سودے بازی کرتا ہے، بلکہ اپنی کامیابی کے لئے مسلسل جدوجہد اور پیہم کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَنْ لَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ" (شاید آپ غم میں اپنی جان دے ڈالیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں)، صدق اللّٰہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم وصلی اللّٰہ علی نبینا ومولانا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین۔

نبی کریم ﷺ کی معاشرتی زندگی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ شریعت اسلامی کا اہم ماخذ ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان کی زندگی کے لئے واجب التقلید نمونہ ہے، اس سے ایک طرف شریعت کے بہت سے احکام و ہدایات ملتے ہیں، دوسری طرف اسی سے ہم کو اسلامی زندگی کا مثالی نمونہ ملتا ہے۔ اس حیات طیبہ کو سن کر اور پڑھ کر مسلمان کا دل و دماغ جو کچھ اخذ کرتا ہے اس سے اس کی دنیا بھی بنتی ہے اور دین بھی بنتا ہے۔ آپ ﷺ نے جو فرمایا اور آپ ﷺ نے جو کیا اور آپ ﷺ نے جو دیکھا اور ہونے دیا، اس سب کو حدیث کا نام دیا جاتا ہے، اور حدیث شریعت اسلامی کا ایک بہت بڑا ستون ہے، لہٰذا مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا جی لگا کے مطالعہ کرے، اپنے جلسوں میں تقریروں میں گفتگوؤں میں اس کی باتوں کا چرچا کرے ان باتوں سے سبق لے اور ان کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرے جن کو مستند کتابوں میں نقل کیا گیا ہے اور جن کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے خواہ وہ زندگی دین کے معاملات کی ہو، خواہ دنیا کے معاملات کی، لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں کی توجہ اس کی طرف بہت کم ہے، ربیع الاول آتا ہے، سیرت النبیؐ کے جلسوں کی رونق آجاتی ہے، یہ جلسے بہت مبارک ہیں اور ضرور کرنا چاہئیں، لیکن اس بات کی فکر بھی بہت ضروری ہے کہ ان جلسوں سے صحیح فائدہ اٹھایا جائے، شرکت کرنے والوں کی اخلاقیات درست ہوں اور وہ ان سے سیکھیں اور نصیحت حاصل کریں، اس سلسلہ میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کتنے لوگوں کی زندگیوں میں ان کے سننے اور جاننے سے تبدیلی آئی، کتنے لوگوں کی زندگی شریعت اسلامی کے سانچے میں ڈھلی۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر اس کا مطلب ہے کہ جلسہ کرنے والوں میں کوئی نہ کوئی بے خیالی ہے کہ جو فائدہ حاصل کر سکتے

تھے وہ حاصل نہ کر سکے اور اس مقصد کو پورا نہ کر سکے جس مقصد کے نام پر یہ جلسے کئے جاتے ہیں، وہ صرف معجزات یا ایسے کمالات کے بیان میں محدود ہو کر رہ گئے جن پر آپ ﷺ کے امتیوں کا عمل ممکن نہیں یا بہت ہی مشکل ہے دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ نہ مقررین اس کا خیال کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے نصیحت آمیز پہلوؤں کو بیان کریں اور نہ سامعین کو اس کا شوق کہ وہ باتیں سنیں جن سے ان کو سبق ملتا ہو، ہاں چمک دمک، ذوق و پسند کی باتیں، خوش کن جلسہ تو ہو جاتا ہے، لیکن اس سے فائدہ پہنچنے کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اگر اس سب میں حیات طیبہ مبارکہ کی عملی روح بیان کی جاتی اور حیات طیبہ کا مقصد چمکتا نظر آتا تو زندگیوں کو روشن کر دیتا اور اعمال کی اصلاح کر دیتا جس کی اس وقت امت کو بہت ضرورت ہے اور امت اس سے بہت ہٹ گئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار کے محبوب اور عظیم المرتبت نبی تھے تو آپ ﷺ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ناز و نعم میں زندگی گزارتے اور آرام و راحت کے ساتھ اپنی نبوت کی ذمہ داری پوری کرتے، شان و شوکت بھی نظر آتی عظمت و قوت بھی خوب ظاہر ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آپ ﷺ نے غربت جیسی اور سادہ طرز کی زندگی گزاری، نہ اس میں دولت مندی کا اظہار تھا اور نہ شان و عظمت کا دکھاوا، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ آپ ﷺ کو زندگی کی بہت صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں، مصیبتیں جھیلنا پڑیں، اور یہ سب دعوت حق کو عام کرنے کے لئے اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے، انسانوں کے ساتھ ہمدردی و خیر خواہی کرنے کے لئے اور اپنی امت کو زندگی کے رضائے الٰہی والے طریقوں کو بتانے کے لئے گوارا کرنا پڑا، خود تکلیف اٹھاتے دوسروں کو آرام پہنچاتے، غریبوں کی مدد کرتے، سب کے ساتھ برابری اور اخلاق کے ساتھ پیش آتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں جب تشریف لائے تو پیدا ہونے سے قبل اور پیدا ہونے کے چند سال بعد والد والدہ کی شفقتوں سے محرومی برداشت کرنی پڑی، ذرا بڑے ہوئے تو شفیق دادا بھی نہ رہے، صرف چچا کی ہمدردی و شفقت باقی رہی لیکن چچا کو غربت کا سامنا تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ کو بھی غربت کا سامنا کرنا ہوا، یتیمی پھر غربت دوہری

دشواری، آپ کچھ بڑے ہوئے تو معاشی لحاظ سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تدبیر کی آپ ﷺ نے اپنے قبیلہ کے دستور کے مطابق کاروبار و تجارت کی طرف توجہ دی، آپ ﷺ کی دیانت و امانت اثر لائی اور کاروبار کے ذریعہ آپ ﷺ کے اقتصادی حالات میں تبدیلی آئی، اس سے آپ ﷺ نے شفیق چچا کی مدد بھی کی، اور وہ اس طرح کہ ان کے ایک صاحبزادہ کو آپ ﷺ نے اپنی کفالت میں لے کر ان کے بوجھ کو ہلکا کیا، دوسری طرف قوم کے سامنے آپ ﷺ کے جو اعلیٰ انسانی اخلاق و کردار آئے ان سے آپ ﷺ کو سب کی محبت و قدر حاصل ہوئی، آپ ﷺ کا نام سب نے امانت دار رکھ دیا اور آپ سب کی آنکھوں کا تارہ بن گئے، ہر ایک بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا اور تعریف کرنے لگا کہ اتنے میں نبوت کی ذمہ داری ملی اور اس کا کام سپرد ہوا، اس کام کے کرنے سے لوگوں کا سابق رویہ بدل گیا آپ ﷺ کے در پئے آزار بن گئے، اگر پہلے جیسے رہتے تو قریش میں آپ سے زیادہ پسندیدہ اور محترم شخص کوئی اور نہ ہوتا، آپؐ قریش کے بادشاہ کی طرح ہو جاتے اور آپ کو دنیاوی وجاہت انتہا درجہ کی حاصل ہوتی، آپ ﷺ جو کہتے قریش اس کو بجالاتے، آپ ﷺ کے لئے سب اپنی نگاہیں فرش راہ کرتے لیکن خدا کو آپ ﷺ سے دعوت و اصلاح کا کام لینا تھا آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ قوم کے عقیدوں اور مذہبی عادتوں کی جو بگڑی ہوئی شکلیں چل رہی تھیں ان کی اصلاح کا پیغام سنائیں، آپ ﷺ نے رسالت کی ذمہ داری اٹھالی اور اس کی انجام دہی سے جو تکلیفوں کا سلسلہ شروع ہونا تھا اس کے لئے تیار ہو گئے آپ ﷺ کو آرام مطلوب نہ تھا آپ ﷺ کو انسانوں کی خیر خواہی مطلوب تھی، چنانچہ عداوت کا جو طوفان اٹھا وہ زبردست تھا، آپ ﷺ کو امانت دار اور نیک کردار کہنے والے اور عزت و احترام سے پکارنے والے بگڑ گئے، پہلے جو تعریف کرتے تھے اب برائی کرنے لگے، پہلے آنکھوں میں بٹھانے کے لئے تیار رہتے تھے، اب پتھر مارنے لگے، عزت کرنے والے مذاق اڑانے لگے، گندگی اور کیچڑ ڈالنے لگے، آپ ﷺ نے یہ سب جھیلا اور پیغام ... سناتے رہے، حق و انسانیت کے لئے حکم الٰہی کی بجا آوری کے لئے سب برداشت کرتے، جواب نہ دیتے، صبر آزما معاملہ تھا، لیکن آپ ﷺ نے عظیم صبر سے کام لیا،

برداشت سے باہر تھا، پھر بھی برداشت کیا، کیونکہ حکم الٰہی تھا کہ برداشت کرو، جواب نہ دو مخالفت کے باوجود نیکی کی تلقین کرتے اور حق کا پیغام پہنچاتے رہے، ۱۳ر سال اسی جدوجہد اور صبر میں گزرے، اور برداشت اور صبر کا حکم جاری رہا حتی کہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور دوسری جگہ منتقل ہونا پڑا، بالآخر خدا کی طرف سے اجازت ملی کہ بہت ظلم ہو چکا اب جواب دے سکتے ہو، اب مقابلہ پڑے تو مقابلہ کر سکتے ہو، اللہ کی مدد ہوگی، یہاں سے مقابلہ کا آغاز ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی جو مدد تکلیف جھیلنے اور برداشت کرنے میں آتی تھی وہ مقابلہ کی اجازت کے بعد جاری رہی اور میدان جنگ میں آئی آپؐ پر دشمن حملہ آور ہوتا، آپ ﷺ کے نئے وطن مدینہ پر چڑھائی کرتا، آپؐ مقابلہ کرتے اور بہادری کا ثبوت دیتے، یہ سب حق کے لئے تھا اپنے پروردگار کی رضا کے حصول کے لئے تھا نفس کشی تھی، راحت کی قربانی تھی، مکہ کی ۱۳ر سالہ مدت میں بھی قربانی اور مدینہ کی ۱۰ر سالہ مدت میں بھی خطرات کا مقابلہ اور قربانی، اعلیٰ اور پاکیزہ زندگی، انسانیت، رواداری، برداشت، ثابت قدمی، بہادری، شرافت وعظمت، کردار کے طرح طرح کے انداز، یہ تھی انسانیت نواز مثالی زندگی، آپ ﷺ کی ایک ایک ادا، ایک ایک گوشہ آپ ﷺ کی امت کے لئے رہنما اصول تھا نمونہ کا کردار تھا اور وہ انسانی زندگی کے متنوع ومختلف پہلوؤں پر مشتمل تھا، آپ ﷺ اپنے رفقاء کے ساتھ ایک نہایت ہمدرد اور انس ومحبت رکھنے والے رفیق تھے، عام انسانوں کے لئے غمگسار اور انسانیت نواز انسان تھے، کمزوروں، غریبوں کی مدد کرنے والے، چھوٹوں پر شفیق، بڑی عمر والوں کی عمر کا خیال کرنے والے، گھر کے اندر گھر کے ایک عام فرد، اپنے اصحاب ورفقاء میں ان کے احساسات وجذبات کا خیال رکھنے والے تھے، آپ ﷺ کی تعلیم تھی چھوٹے اور بڑے دونوں ایک جگہ ہوں، تو بڑے کے بڑا ہونے کا خیال کرو، بچوں کے ساتھ شفقت ورعایت کا یہ حال تھا کہ ایک بچہ ابوعمیر تھا اس کے پاس ایک چڑیا تھی جو مرگئی تھی، آپ ﷺ اس سے ملے تو اس سے ہمدردانہ طریقہ سے پوچھا اے ابوعمیر! تمہارا پرندہ نغیر کیا ہوا؟ "یا أبا عمیر ما فعل النُّغَیْرُ" آپ کو کوئی بوڑھی عورت راستہ میں روک لیتی اور اپنی بات کہتی رہتی آپ سنتے رہتے اور اس کا دل چھوٹا نہ کرتے، آپؐ اپنے رفقاء کے

ساتھ ہوتے تو ان سے انس و دلچسپی کی بات کرتے، ایک مرتبہ ایک بوڑھی عورت نے آپؐ سے جنت میں جانے کی دعا کی درخواست کی آپ ﷺ نے فرمایا کہ بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی، وہ روتی ہوئی لوٹنے لگی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس سے کہہ دو کہ جنت میں بڑھاپے کی حالت میں نہیں داخل ہوگی۔'' ایک شخص نے آپ ﷺ سے اپنی ضرورت کے لئے اونٹ مانگا، آپ ﷺ نے ازراہ مزاح فرمایا کہ تمہیں اونٹ کا بچہ دوں گا، وہ کہنے لگا یارسول اللہ بچہ سے میرا کام نہ چلے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ہر اونٹ اونٹ کا بچہ ہی تو ہوتا ہے ایک مرتبہ رات کا وقت تھا اور کوئی خطرناک آواز آئی جیسے کوئی دشمن ہو یا خوفناک جانور، آپ ﷺ نے تحقیق کے لئے اپنے رفقاء کی طرف دیکھا وہ کچھ ڈرے سے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں خود جا کر دیکھتا ہوں اور آپ ﷺ نے کسی پر دباؤ نہیں ڈالا خود جا کر دیکھا اور تحقیق کر کے تشریف لائے۔

اسلام میں ضرورت محسوس ہونے پر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، جو عام مسلمانوں کے لئے چار کے اندر محدود رکھی گئی ہے البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ کی اجازت دی گئی لیکن آپ ﷺ نے عنفوان شباب کا سارا زمانہ صرف ایک بیوی کے ساتھ گزارا اور وہ بھی آپ ﷺ سے عمر میں بڑی تھیں، بعد میں نبوت کے کام کے ساتھ حکومت و سیاست، صلح و جنگ اور دیگر معاملات کی ذمہ داریاں آپ ﷺ کی بہت بڑھ گئیں، اس وقت آپ ﷺ نے کئی بیویوں کی اجازت سے فائدہ اٹھایا اور اس اجازت سے آپؐ نے بہت سی پیچیدگیوں کو حل کرنے میں بھی مدد لی، آپ ﷺ نے اس کے ذریعہ یہ بھی دکھایا کہ اسلام میں ذات پات، سماجی پوزیشن اور رواجی عادتوں کے فرق کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات میں اپنے معزز خاندان کی اور دیگر خاندانوں کی بھی بیویاں شامل کیں، آپ ﷺ نے نومسلم خاتون کو بھی داخل زوجیت کیا، باندی بن کر آنے والی خاتون کو بھی آزاد کر کے داخل زوجیت کیا، اپنے متبنّیٰ کی مطلقہ کو بھی شامل کیا جو کہ عرب کے معاشرے میں غلط سمجھا جاتا تھا لیکن خدا کا حکم آیا کہ متبنّیٰ کو بیٹے کی طرح نہ سمجھا جائے اور اس کو بیٹے کے حقوق بھی نہ دیئے جائیں، چنانچہ

آپ ﷺ نے عرب معاشرے کے متبنّیٰ کے رواج کو توڑا آپ ﷺ نے ایسی شادیاں بھی کیں جن میں تعلق والوں کی دلداری مقصود تھی، ایسی بھی شادی کی جس سے غلط رواج کو باطل کرنا تھا، ایسی بھی کی جس میں دوسروں کی خدمات وتعلق کا صلہ تھا، پھر ان سب کے درمیان ایسا انصاف اور برابری کا برتاؤ کیا کہ جو اپنی نظیر آپ ہے، اپنی پسند کو باعث ترجیح نہیں بنایا، مدینہ منورہ میں فدک وخیبر میں آپ کو کچھ جائداد حاصل ہوگئی تھی، فصل پر اس کا غلہ آتا تو آپ ﷺ وہ برابر اپنی تمام ازواج مطہرات میں تقسیم کرکے ہر ایک کو اس کے حصہ کا مالک بنا دیتے تھے، آپ ﷺ اپنے دنوں اور راتوں کو ازواج مطہرات میں برابری کے ساتھ تقسیم کرتے تھے اور اس میں ہر ایک کا حق پورا ادا کرتے تھے اور جب آپ کا آخری مرض ہوا تو بیماری کے تقاضہ سے آپ ﷺ نے ایک ہی گھر میں رہ کر علاج کرانا مناسب سمجھا، لیکن آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات سے اس کی اجازت لی، جب اجازت مل گئی تب آپ ﷺ نے اس پر عمل کیا، جب آپ سفروں میں جاتے تو کسی ایک بیوی کو ساتھ لے جاتے اور ایسے میں خود اپنی مرضی وپسند سے انتخاب نہ کرتے بلکہ قرعہ ڈالتے، جس کا نام نکلتا اس کو لے جاتے آپ ﷺ اپنے اہل خانہ کے لئے اس طرح اخلاق ومحبت کا برتاؤ کرتے، جیسا شوہر کو بیوی کے ساتھ کرنا چاہئے، نبی ہونے کی بنا پر اس سے برتری کے طرز پر معاملہ نہ کرتے، بیوی کے انس وخوشی کا لحاظ رکھتے، ایک مرتبہ کچھ حبشی جنگجو جو اپنے ملک کے جنگی کرتب آپ کے مکان کے سامنے دکھا رہے تھے آپ ﷺ نے اپنی اہلیہ کو بھی دکھایا، بلکہ دروازہ پر کھڑے ہو کر آڑ بنادی اور اپنے کاندھے کے بیچ سے ان کو دیکھنے کا موقع دیا، آپ ﷺ ایک بار بچوں کو پیار کر رہے تھے، ایک صحابی کو تعجب ہوا کہ آپ ﷺ نبی جیسے باوقار منصب پر ہونے کے باوجود یہ عام لوگوں جیسا معاملہ کر رہے ہیں لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ رحم وشفقت کا جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں رکھا ہے اس کو دبانا نہ چاہئے، آپ ﷺ کے ایک نواسہ کا انتقال ہوا تھا جو بچہ تھا، آپ کی صاحبزادی نے آپ ﷺ کو بلوایا، آپ تشریف لائے بچہ کو گود میں لیا، آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، خود آپ کے صاحبزادہ کا بھی انتقال ہوا آپ ﷺ نے اپنے جذبات غم کو اپنے آنسو سے

ظاہر کیا اور فرمایا کہ میرا دل بڑا غمزدہ ہوا، مسرت کے موقع پر مسرت کا بھی اظہار ہوتا تھا، ایک غزوہ میں فتح کے موقع پر حضرت جعفرؓ، جو آپ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے اور آپ ﷺ کو ان سے تعلق بھی بہت تھا، ہجرت حبشہ میں ایک عرصہ رہنے کے بعد آئے تو آپ ﷺ نے مسرت کیفیت کے ساتھ فرمایا کہ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ مجھے اس جنگ میں فتح سے خوشی زیادہ ہوئی یا جعفر کے آنے سے خوشی زیادہ ہوئی۔

آپ اپنے رشتہ داروں سے محبت کے ساتھ ساتھ تمام صحابہ سے بلکہ تمام انسانوں کے ساتھ بھی ہمدردی اور محبت اور رواداری کا برتاؤ فرماتے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی پر غصہ نہ کرتے، خواہ آپ ﷺ کا کیسا ہی نقصان ہو اور اذیت پہنچے، آپ ﷺ نے کبھی اپنے کسی کام کرنے والے کو اس کی غلطی پر مارا نہیں، اپنے کسی صحابی کی کسی غلطی پر ڈانٹا نہیں، ہاں اگر اسلام اور دین کے معاملہ میں کوئی غلطی کرتا تو آپ بہت ناراض ہوتے، ایک مرتبہ آپ ﷺ اپنے آخری زمانہ میں یہ فرمانے لگے کہ دیکھو اگر کسی کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو، میری طرف سے اس کے ساتھ کوئی زیادتی ہوگئی ہو تو وہ اس کا بدلہ اسی زندگی میں لے لے، آخرت پر نہ اٹھا رکھے اس پر ایک صحابی نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ آپ ﷺ کا کوڑا میری پیٹھ پر لگ گیا تھا اس پر آپ ﷺ نے اپنی پیٹھ کھول دی کہ اس پر کوڑا مار لو وہ صحابی کوڑا کیا مارتے لپٹ گئے اور مبارک پیٹھ کو چوم لیا، اپنے رفقاء کے ساتھ اتنے بااخلاق تھے کہ کوئی فائدہ کی بات ہوتی تو اپنے ساتھی کو ترجیح دیتے، آگے بڑھاتے، ذمہ داری اور مشقت کی بات ہوتی تو خود آگے بڑھ آتے، آپ ﷺ نے اعلان فرمادیا تھا کہ انتقال کرنے والا جائیداد چھوڑ جائے تو وہ اس کے وارثوں کی ہے اور اگر قرضہ چھوڑ جائے تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے، آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی بہت چہیتی بیٹی تھیں، ہمیشہ ساتھ رہتی تھیں، دوسری صاحبزادیوں کی طرح اپنے شوہروں کے ساتھ علیحدہ نہیں رہیں، کیونکہ ان کے شوہر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے اپنے بیٹے کی طرح رکھا تھا پھر داماد بنایا، وہ ساتھ میں رہتے تھے لیکن بیٹی کو چہیتی ہونے کے باوجود، آپ ﷺ نے ان کو دولت وثروت نہیں عطا کی نہ ایسا انتظام فرمایا کہ وہ کسی خادمہ کو رکھ

سکیں، وہ گھر کا سارا کام اور شوہر کی خدمت اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں، پانی بھی خود بھر کر لاتی تھیں، آپ ﷺ نے ان کو کوئی خادم یا خادمہ مہیا نہیں کی حالانکہ خادم اور خادمائیں آتی تھیں اور آپ ﷺ دوسروں کو دیتے تھے، حضرت فاطمہؓ نے عرض بھی کیا آپ ﷺ نے ان کو کچھ پڑھنے کو بتا دیا مگر خادمہ نہیں دی، حالانکہ یوں بہت محبت و شفقت کرتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی بہت خیال فرماتے تھے، ایک بار حضرت علی ﷺ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کچھ ناگواری ہوئی جیسی شوہر و بیوی کے درمیان کبھی کبھی ہو جاتی ہے، حضرت علیؓ مسجد میں جا کر لیٹ گئے آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو خود منانے تشریف لے گئے حالانکہ حضرت علیؓ آپ ﷺ سے بہت چھوٹے تھے، آپ ﷺ نے ان کی پرورش بچپن سے کی تھی لیکن آپ ﷺ نے ان کو محبت کے ساتھ جگایا، فرمایا ارے تمہارے جسم میں مٹی بھر گئی ہے اٹھو! کوئی غصہ نہیں کیا اور نہ اپنی صاحبزادی کی طرف داری میں ان کو سخت بات کہی، آپ ﷺ بات کرنے والے کی بات اخلاق و ہمدردی کے ساتھ سنتے تھے، وہ کچھ مانگتا اور وہ چیز ہوتی تو ضرور دے دیتے تھے، خواہ خود کو تکلیف ہو جائے، ایک مرتبہ ایک نئی شال آپ ﷺ کے پاس آئی، کسی نے مانگ لی آپ ﷺ نے اس وقت اس کو دے دیا حالانکہ آپ ﷺ کو ضرورت بھی تھی اور جب مانگنے والے کو دینے کے لئے آپ ﷺ کے پاس کچھ نہ ہوتا تو نرم کلامی اور ہمدردی کے ساتھ اس کو واپس کرتے، آپ ﷺ اپنے صحابہ میں یوں گھل مل کر رہتے اور بات کرتے کہ نہ جاننے والوں کو پریشانی ہو جاتی کہ مجمع میں کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ہجرت مدینہ کے موقع پر جب قبا پہنچے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کے ساتھ دیکھنے والے نہ پہچان سکے کہ ان میں کون رسول اللہ ہیں، جب دھوپ سے آڑ کر دی، تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ وہ ہوں گے جن پر دھوپ کی وجہ سے چادر تانی گئی۔

ضرورت مندوں کی مدد میں اس قدر بڑھے ہوئے تھے اس کی مثال نہیں ملتی اس کے ساتھ ساتھ اپنے رب کی عبادت اور خوشنودی کے لئے جو زیادہ سے زیادہ ہو سکتا تھا کرتے تھے، رات کو تہجد اتنی دیر تک پڑھتے کہ پیروں میں ورم آجاتا، نفل روزے اتنے

رکھتے کہ بعض وقت ایک ایک مہینہ گزر جاتا اور رمضان میں عبادت اور غریبوں کی مدد اپنے انتہا کو پہنچ جاتی، ایک مرتبہ ایک صحابی نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ عبادت میں اتنا کیوں اپنے کو کھپاتے ہیں، آپ ﷺ کے اگلے پچھلے گناہ سب اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ، کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں، وسیع القلب اتنے تھے کہ مکہ میں تیرہ سال سخت تکلیف دیئے جانے کے باوجود جب مکہ پر آپ کا غلبہ ہوا اور آپ ﷺ فاتحانہ شہر میں داخل ہوئے اور وہ لوگ سامنے آئے جنھوں نے آپ کو تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، سازش کر کے رات میں قتل کر دینے کی بھی تدبیر کی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جاؤ تم سب آزاد ہو میں انتقام نہیں لیتا''، دس سال مکہ میں ایذاء دیئے جانے کے بعد طائف تشریف لے گئے تھے کہ وہاں کوئی بااثر شیخ قبیلہ اگر آپ ﷺ کی بات کو قبول کر لے تو اس سے مکہ میں آپ کو تقویت وحفاظت مل سکے گی، لیکن وہاں کے سرداروں نے مکہ کے سرداروں کا سا ہی رویہ اپنایا، آپ ﷺ کو شہر سے نکال دیا، اوباش لڑکے پیچھے لگا دیئے جو پتھر مارتے تھے آپ ﷺ کی اس کسمپرسی اور بے بسی پر پروردگار کو بہت رحم آیا اس نے فرشتہ بھیجا کہ آپ کہیں تو ان طائف والوں کے اوپر ان کے دونوں جانب کے پہاڑوں کو ملا دیا جائے اور ان کا خاتمہ کر دیا جائے، آپ راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ: ''اگر یہ بات نہیں مانتے تو کیا عجب ہے کہ ان کے بعد آنے والی نسل بات مان لے اور مسلمان ہو جائے'' اور سخت تکلیف اٹھانے کے باوجود انتقامی طریقہ نہیں اختیار کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بحیثیت نبی کے بہت اونچا ہے، لیکن اسی کے ساتھ بحیثیت انسان کے اخلاق، محبت، ہمدردی، انسان نوازی، خوش اخلاقی، خاکساری، تواضع، مہمان داری، غرباء پروری، مصیبت زدوں کے ساتھ ہمدردی بھی انتہائی بڑھی ہوئی تھی، ایک طرف آپ ﷺ نبوت کے کمالات کا مظہر تھے اور دوسری طرف انسانی خوبیوں کا اعلیٰ پیکر تھے، ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ دونوں پہلوؤں سے کرنا چاہئے، ایک طرف یہ کہ اس سے ہم کو شریعت کی تعلیمات ملتی ہیں جن پر عمل کر کے خدا کو راضی کر سکتے ہیں اور اپنی آخرت بنا سکتے ہیں، دوسری طرف یہ کہ انسانی وبشری خوبیوں اور خصلتوں

کے کیسے کیسے اعلیٰ نمونے سامنے آتے ہیں، جن کے اختیار کرنے سے دنیاوی اعتبار سے اور سماج کے اندر ہم ایک اعلیٰ خصلتوں کے انسان بن سکتے ہیں، ہم صرف روشنی کر کے اور صرف معجزات بیان کر کے خود اپنے کو بہت مسرور تو کر لیتے ہیں لیکن رسول پاک کو خوش کرنے کے لئے یہ روشنی اور شاندار مظاہرے مفید نہیں، مفید تو آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے اخذ فیض سے آپ ﷺ کی سنت کی اتباع کرنا، انسانوں کے لئے ہمدردی اور محبت وعنایت کا اختیار کرنا ہے، ہم کو دیکھنا چاہئے کہ ہم اپنے ذوق کی تسکین اور دکھاوا کرنا چاہتے ہیں یا رسول پاک ﷺ کی خوشی کے کام کرنا چاہتے ہیں، ہماری سیرت پاک کی محفلوں میں اتباع سنت رسول ﷺ کو ضرور سامنے لانا چاہئے تا کہ آخرت میں آپ ﷺ سے اگر ملاقات مقدر ہو تو آپ ﷺ یہ نہ فرمائیں کہ تم نے ہم کو تو خوش نہیں کیا صرف اپنے کو ہی خوش کرتے رہے اور شان وشکوہ سے اپنا دل بہلاتے رہے، اور ہماری سنتیں مٹتی رہیں، کتنے غریب غربت برداشت کرتے رہے اور دولت مند دولت کو صرف ذوق اور دکھاوے میں اڑاتے رہے، امت پریشان رہی اور خوشحال لوگ مزے اڑاتے رہے۔

سیرت نبوی میں اعتدال وتوازن

ہمارے حضور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کام میں اعتدال کا طریقہ اختیار کرنے کو پسند فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خیر الأمور أوسطها" (معاملات میں بہتر وہ ہیں جو درمیانی ہوں)۔ چنانچہ آپ ﷺ نے متعدد موقعوں پر از خود اپنے عمل سے بتایا اور توجہ دلائی۔ آپ ﷺ کے پاس تین صحابی بڑے ایمانی جذبے کے ساتھ آئے۔ ایک نے کہا کہ رات رات بھر میں عبادت کیا کروں گا، دوسرے نے کہا کہ میں روزہ رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں کبھی شادی نہ کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ میں تم میں سب سے زیادہ متقی اور اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور رات کو عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور روزے رکھتا ہوں اور روزے سے خالی دن بھی چھوڑتا ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقے پر نہیں وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اس طرح حج کے موقع پر ایک صحابی مکہ میں بیمار ہو گئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ میں سوچتا ہوں کہ اپنا سارا مال ومتاع اللہ کی راہ میں صدقہ کردوں، آپ ﷺ نے فرمایا، سارا مال صدقہ نہ کرو۔ انھوں نے کہا کہ نصف صدقہ کردوں، آپ ﷺ نے فرمایا نصف نہ کرو، انھوں نے کہا ایک تہائی کردوں، فرمایا ایک تہائی کر سکتے ہو اگر چہ وہ بھی زیادہ ہے، دیکھو تم اپنے بچوں کے لئے اتنا مال چھوڑ جاؤ کہ وہ اس سے اپنا کام چلا سکیں یہ بہتر ہے اس بات سے کہ تم ان کو فقیر کی طرح چھوڑ جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ اسی طرح ایک صاحب اپنی ضرورتیں مانگ کر پوری کرتے تھے آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ تمہارے پاس کچھ سامان ہے، انھوں نے بتایا کہ ایک پیالہ ہے اور ایک چادر، آپ ﷺ نے کہا کہ لاؤ۔ آپ ﷺ نے اس کو نیلام فرمایا، وہ دو درہم میں فروخت ہوا، آپ ﷺ نے

ایک درہم ان کو دیا کہ اس سے تم اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے کھانے کا انتظام کرو، اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خریدی اس میں دستہ لکڑی سے کاٹ کر خود لگایا اور ان صاحب کو دیا کہ اس سے لکڑی کاٹ کر لایا کرو اور فروخت کیا کرو اور اس طرح اپنی کمائی سے کام چلایا کرو۔ ایک طرف آپ ﷺ کا یہ انداز تھا، دوسری طرف یہ تھا کہ دو بھائی تھے ایک بھائی کام کاج اور محنت کرتے، دوسرے بھائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دین سیکھنے کے لئے حاضری دیتے تھے تو ایک روز کام کرنے والے بھائی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یہ میرے بھائی ہیں ہاتھ نہیں بٹاتے اپنا سارا وقت آپ ﷺ کی خدمت میں ہی رہ کر گزار دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم کو کام سے جو آمدنی ہوتی ہے کیا عجب ہے کہ تمہارے ان بھائی کے دین سیکھنے کی برکت ہی سے ہو رہی ہو۔ یعنی آپ ﷺ نے محسوس کرلیا کہ وسیلہ اختیار کرنے کے باوجود رزق اللہ دیتا ہے اس کی مرضی کا کام ہو تو برکت ہوتی ہے ورنہ تدبیر بھی کارگر نہیں ہے۔

حضرات انصار رضی اللہ عنہم زراعتی کام کرنے والے تھے جہاد اور دوسرے دینی کاموں کے تسلسل سے وہ کاشتکاری اور باغبانی کو ایک عرصہ تک کوئی زیادہ وقت نہ دے سکے ایک موقع پر وہ یہ محسوس کر کے کہ ہم اب اپنی کاشتکاری وغیرہ میں مسلسل لگ سکتے ہیں، ادھر متوجہ ہوئے تو ان کے کمائی کے کام میں لگ جانے سے اسلام کے بڑھتے ہوئے قافلہ کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا اس لئے قرآن پاک میں فرمایا گیا "وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" کہ (اپنے کو تباہی میں نہ ڈالو)، یعنی اگر تم دنیا کی طرف (اگرچہ وہ جائز ہے) دین کا کام چھوڑ کر لگ گئے تو یہ تمہارے لئے تباہی کی بات ہوگی۔

یہ تھا وہ اعتدال اور درمیان کی راہ جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ڈالا تھا اور اس کی تربیت دی تھی کہ اپنی دنیاوی زندگی کی حسب ضرورت فکر رکھو اور اپنے دین کے حق کو بھی پوری طرح ادا کرو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "الدین یسر" کہ (مذہب آسان ہے)، اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کے لئے مذہب کو آسان بنا دیا ہے اس پر پوری طرح عمل کرنا آسان ہے، دین پر پورا عمل کرنے سے برکت ہوتی ہے اور اللہ کی نصرت کے وعدے

پورے ہوتے ہیں، امت محمدیہ کے لئے اس میں آسانی ہے اور یہی اس فلاح کی راہ ہے۔

اسلام میں دین و دنیا دونوں کی رعایت رکھی گئی ہے، اس میں آسانی کے ساتھ اعتدال بھی ہے اس طرح دین پر عمل آسانی اور خوبی کے ساتھ ہوتا ہے، آدمی کو ایسے مجاہدے نہیں کرنا پڑتے کہ اس کی طاقت سے باہر ہوں، یہ ایسی نعمت ہے کہ کسی دوسرے مذہب میں نہ ملے گی، اس کے بعد مسلمانوں کا دین پر عمل کرنے میں کوتاہی کرنا بہت عجیب بات بھی ہے اور افسوس کی بات بھی ہے۔

رسول پاک ﷺ کی انسانیت نوازی اور رحمۃ للعالمینی

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کی اعلیٰ خوبیوں کے ساتھ اخلاق طیبہ محبت، رحم دلی اور انسانی ہمدردی کے حامل تھے کہ اس سے زیادہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں، قرآن مجید میں فرمایا گیا "اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" کہ (آپ عظیم اخلاق کے حامل ہیں) اور فرمایا گیا "وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَلَمِيْنَ" کہ (ہم نے تم کو سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے)، آپ ﷺ ایک طرف تو اپنے پروردگار کو راضی رکھنے کے لئے ہر طرح کی مشقت اور تکلیف اٹھاتے اور اس کی مرضیات پر عمل کرتے، دوسری طرف سارے انسانوں کے ساتھ ہمدردی ومحبت کا ایسا عمل کرتے کہ اس کی مثال نہیں ملتی، آپ عبادت گذار اور شب زندہ دار ایسے تھے کہ رات کی نماز یعنی تہجد میں اتنی اتنی دیر تک کھڑے رہتے کہ پیروں میں ورم آجاتا، روزے اتنے رکھتے کہ رمضان سے قبل شعبان کا مہینہ بھی اکثر وبیشتر روزوں میں گزر جاتا، مال کو اللہ کی راہ میں اتنا خرچ کرتے کہ خود کوئی ایسی چیز نہ ہوتی جس کے لئے گھر والوں کو آگ جلانا پڑتی، کبھی کھجور کے کچھ دانے حاصل ہوگئے انہی سے کام چلا لیا اور کبھی بکری کا دودھ ہوا اس کو پی کر مطمئن ہوگئے، کبھی کچھ بھی نہ ملا تو یوں بے کھائے پیے رہ گئے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ مال ومتاع سے بالکل محروم تھے، ایسا نہیں تھا بلکہ عموماً آپ ﷺ کی ضرورت کے مطابق مال ہوجاتا تھا، مدینہ منورہ میں آپ کی کل آمدنی کچھ کھیتوں اور باغوں سے بھی ہونے لگی تھی جو آپ ﷺ کو حاصل ہوگئے تھے، لیکن آپ ﷺ کی طرف سے دوسروں کی مدد، داد ودہش اور مہمانوں کی مہمان داری اور اصحاب صفہ (جو دین سیکھنے کے لئے آپ ﷺ کے مکان کے سامنے مسجد کے ایک سرے پر مقیم رہتے تھے) ان کے کھانے کی ذمہ داری بھی آپ ﷺ اپنی ذاتی ذمہ

داری کی طرح اٹھائے ہوئے تھے، یہ اصحاب صفہ بعض بعض مرتبہ ۷۰ کی تعداد تک پہنچ گئے تھے، ان میں ایک صحابی حضرت ابو ہریرہؓ تھے جنھوں نے وہاں رہ کر خوب حدیثیں سنیں اور علم دین سیکھا، چنانچہ آج حدیث شریف کا خاصا حصہ ان ہی سے مروی ہے، ان ہی سے روایت ہے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا، اصحاب صفہ بھی بھوکے تھے کہ آپ ﷺ کے پاس کہیں سے دودھ کا ایک پیالہ ہدیہ میں آیا، آپ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو بلایا اور فرمایا: ''یہ دودھ آیا ہے سب اصحاب صفہ کو بلا لاؤ''، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھے تعجب ہوا کہ اتنے دودھ میں کتنے آدمی کام چلا سکیں گے، یہ تو خود آپ ﷺ پی لیتے اور کچھ بچتا تو مجھ کو دے دیتے، بجائے اس کے متعدد آدمیوں کو بلا کر پلایا جائے کسی کا بھلا نہ ہوگا، لیکن کیا کرتا حکم تھا، میں بلا لایا، آپ ﷺ نے وہ پیالہ ایک کو دیا کہ پیو! پھر دوسرے کو دیا، پھر تیسرے کو دیا اور وہ سب پیتے رہے اور حیرت کی بات یہ کہ وہ چلتا رہا حتی کہ بلائے ہوئے سب آدمی پورے ہو گئے، پھر آپ ﷺ نے پیالہ اپنے ہاتھوں میں لیا، حضرت ابو ہریرہؓ کو دیکھا اور فرمایا! ''ابو ہریرہ، ہم رہ گئے ہیں اور تم''، حضرت ابو ہریرہؓ کا یوں بھی امتحان ہو رہا تھا کہ ہر پینے والے پر سوچتے ہوں گے کہ دودھ اب ختم ہوا تب ختم ہوا، میری باری دیکھو آتی بھی ہے یا نہیں آتی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کہنے پر کہ اب ہم رہ گئے ہیں اور تم اور پیالہ آپ ﷺ کے ہاتھ میں ہے اور تھوڑا دودھ ہے، ظاہر ہے کہ اب آپ ﷺ ہی مستحق ہیں کہ اس کو پورا کر دیں اور حضرت ابو ہریرہؓ رہ جائیں، حضرت ابو ہریرہؓ نے آپ کے اس جملہ پر کہ اب ہم رہ گئے ہیں اور تم، کہا جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لو اب تم پیو''، وہ کہتے ہیں کہ میں نے پیا اور دودھ پھر بھی بچ گیا، میری طبیعت سیر ہو گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اور پیو، میں نے اور پیا، آپ ﷺ نے فرمایا اور پیو! میں نے کہا یا رسول اللہ، اب طبیعت سیر ہو گئی ہے، پھر آپ ﷺ نے پیالہ واپس لیا اور اس کو پورا کر دیا۔

اس واقعہ کے اندر کئی باتیں آ گئی ہیں ایک تو کھانے پینے کی چیزوں کی کمی، اور جب کوئی چیز آجاتی تو آپ سب کو دے کر کھاتے پیتے، دوسرے یہ اخلاق، کہ چیز کے کم ہونے کے باوجود سب کا خیال رکھنا اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا، تیسری اس بات کی

تربیت دینا کہ دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینے کا مجاہدہ ہو، اور اپنے محروم رہ جانے کا خطرہ برداشت کیا جائے، چوتھے یہ کہ اگر اخلاص اور بے نفسی اور دوسروں کی ہمدردی کے جذبہ سے کام کیا جائے تو برکت ہوتی ہے اور کم چیز زیادہ آدمی کے کام آجاتی ہے، یہ برکت ہر وقت نہیں ہوتی، یہ اس وقت ہوتی ہے جب جذبہ بھی اعلیٰ ہو اور مسئلہ کا حل کوئی دوسرا نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے اور وہ تھوڑی چیز کو زیادہ کے قائم مقام بنا دیتا ہے۔

اس طرح کی برکت کا واقعہ غزوہ خندق میں پیش آیا تھا اور ایک واقعہ صلح حدیبیہ کے موقع پر پیش آیا تھا، جس میں اس طرح اخلاص و نیک نیتی اور ایثار کے جذبہ کی حالت میں کوئی دوسرا حل نہ ہونے پر اللہ تعالیٰ نے تھوڑی چیز کو زیادہ چیز کے قائم مقام بنا دیا تفصیل کی اس وقت گنجائش نہیں، بہر حال یہ بات قابل توجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی ایسا موقع آتا کہ دوسرا بھی ضرورت مند ہو تو اس کو شریک کر لیتے بلکہ اس کو ترجیح دیتے۔ اس ایثار اور سب کی فکر کرنے کے نتیجہ میں آپ کے پاس ضرورت کی چیز کم ہو جانا قدرتی بات تھی، چنانچہ کئی کئی دن فاقوں کی نوبت آجاتی تھی، حالانکہ آپ ﷺ کو اتنا مال ذاتی طور پر حاصل ہوتا تھا کہ روک روک کر خرچ کرتے تو آپ ﷺ اپنا کام اس کے ذریعہ بخوبی چلا سکتے تھے، لیکن آپ ﷺ کو اپنے ساتھیوں کی، اپنے پڑوسیوں کی، اپنے مہمانوں کی اتنی فکر اور ہمدردی ہوتی تھی کہ آپ ﷺ اُن کی فکر، اپنی فکر کی طرح رکھتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک بار اعلان فرمایا کہ کوئی مسلمان انتقال کر جائے تو اس کا چھوڑا ہوا مال اس کے وارثوں کا ہے اور جو وہ قرض چھوڑ گیا ہو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے، بھلا یہ کون کر سکتا ہے، پھر ایک دو کے لئے اپنے تمام ساتھیوں اور ماننے والوں کے لئے، کہ فائدہ ہو تو تم لو اور نقصان ہو تو اس کی تلافی میرے ذمہ ہے۔

آپ ﷺ نے اپنے ان اخلاق و محبت کی خصلتوں سے لوگوں کے دل جیت لئے تھے، جو بھی آپ ﷺ سے ایک مرتبہ مل لیتا آپ ﷺ کا گرویدہ بلکہ فریفتہ ہو جاتا، وہ دیکھتا کہ آپ ﷺ کو دنیاوی فائدے کی کوئی فکر نہیں، آپ ﷺ کو اپنی ذات کے لئے فائدہ

اٹھانے سے کوئی دلچسپی نہیں، دوسروں کی ہمدردی اور دوسروں کی فکر صرف دنیاوی فائدے ہی کے لئے نہ تھی بلکہ زیادہ فکر آخرت کے فائدے کی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال اور تمہاری مثال ایسی ہے جیسے آگ جل رہی ہو اور اس میں لوگ گر رہے ہوں، میں کمر پکڑ پکڑ کر لوگوں کو اس سے بچا رہا ہوں، آپ ﷺ کی یہ فکر اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں فرمایا: "لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى أَن لَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ" (آپ شاید اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے کہ یہ لوگ ایمان والے کیوں نہیں بن جاتے)، اور واقعی آپ ﷺ کڑھتے رہتے تھے کہ لوگ گمراہ ہیں ان کا آخرت میں کیا ہوگا، ان کو گمراہی سے کیسے نکالا جائے، اس کے لئے آپ ﷺ نہ زور زبردستی کرتے تھے، نہ ڈانٹتے نہ سختی کرتے بلکہ محبت سے، اخلاق کے ساتھ ان سے مخاطب ہوتے اور نرمی کے ساتھ سمجھاتے، ایک طرف آپ ﷺ کی انسانیت نوازیاں، ہمدردیاں، دوسری طرف آپ ﷺ کی طرف سے اپنی اور دوسروں کی عافیت کی فکر اور اس فکر میں کڑھنا، یہ ایسا حال تھا کہ جو بھی اس وقت قریب سے دیکھ لیتا بالکل بدل جاتا اور آپ ﷺ کا ہو جاتا، بعض وقت کوئی شخص کفار قریش کے بہکانے پر آپ ﷺ کو قتل کرنے کے لئے آتا اور آپ ﷺ کا سامنا ہوتے ہی، آپ ﷺ کے میٹھے بول سنتے ہی ڈھیلا پڑ جاتا تھا، ارادہ ختم ہو جاتا اور بات چیت ہوتی گرویدہ ہو جاتا اور آپ ﷺ پر فدا ہو کر لوٹتا۔

لوگوں کے فائدے اور آخرت میں نجات کی نظر آپ ﷺ کے دل میں اتنی تھی کہ آپ ﷺ نہایت شفیق، ہمدرد اور محبت کرنے والے بن چکے تھے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس طرح بیان فرمایا: "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ" کہ (تمہارے پاس تم میں کا ہی رسول آیا، اس کو تمہاری تکلیف بہت شاق ہوتی ہے، وہ تمہاری بے حد فکر کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے تو بہت ہی ہمدردی اور رحم کا جذبہ رکھنے والا ہے)۔ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں انسانیت نوازی، اخلاق و محبت کی خصوصیات، اس قدر بڑھی ہوئی غیر معمولی تھیں کہ جس کو واسطہ پڑتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا

تھا، اسی کے ساتھ ساتھ آخرت میں سرخرو ہونے کے لئے آپ کی جو توجہ دہانی اور نصیحت و دعوت تھی کہ آپ ﷺ کڑھتے رہتے تھے کہ کس طرح لوگوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی آخرت کو ٹھیک کرنے اور آخرت میں راحت کی زندگی پانے کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح کریں، ایک طرف آپ ﷺ مجسم ہمدردی اور محبت تھے، دوسری طرف انسانی قدروں کے اعلیٰ درجہ کے محافظ اور داعی تھے، تیسری طرف آپ ﷺ اپنی زندگی کو، اپنے مال ومتاع کو رضائے الٰہی کے حصول اور دنیا و آخرت کی فلاح کا طریقہ بتانے اور خود اس پر عمل کرنے پر لگائے ہوئے تھے۔

سیرت رسول کی عصری افادیت

سیرت رسول کی سب سے اہم خصوصیت اس کا عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ہے سیرت طیبہ سے عقیدہ وعقیدت تک محدود تعلق کے بجائے عملی زندگی کو اس سے ہم آہنگ کرنے کا مرحلہ جب آتا ہے تو اس کی عصری افادیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ دوسرے پیشوایانِ دین و مذہب کی زندگیاں صرف معجزات وخوارق عادت واقعات کے مجموعہ کا نام ہے۔ عام لوگ ان سے محظوظ تو ہو سکتے ہیں لیکن ان واقعات کو راہ نما بنا کر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بھی بے شمار معجزات ظہور میں آئے، مگر ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ اصل اہمیت اس فکر ونظریہ اور کردار کی ہے جو آپ ﷺ نے دنیا کے سامنے عملی نمونہ کے طور پر پیش کیا، ہر شخص اس کو اپنا آئیڈیل بنا سکتا ہے، کوئی ایسی معجزاتی رکاوٹ پیش نہیں آتی ہے جہاں وہ خود کو بے بس محسوس کرنے پر مجبور پائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سارا ریکاڈ موجود ہے، ہر واقعہ کی تفصیلات بھی مہیا ہیں، ان کے تمام عناصر اسی زمین کے چلتے پھرتے ہر انسان کی فطرت اور مزاج کو اس پیغمبرانہ فکر ونظریہ اور نبوی کردار کے مطابق ایک خاص سانچہ میں ڈھالنے کا مواد فراہم کرتے نظر آتے ہیں، یہاں دیوتاؤں سے واسطہ نہیں پڑتا ہے۔ مافوق الفطرت طاقتوں سے مڈبھیڑ نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک ایسے انسان کامل سے سابقہ پیش آتا ہے جو اپنے اعلیٰ اخلاق وکردار کے ذریعہ دیوتاؤں کے لئے بھی قابل رشک ہے، جہاں جذبات و احساسات کی تطہیر وتزکیہ کا عمل اس پایہ کو پہونچ جاتا ہے کہ دیوتا تو دیوتا فرشتے بھی اسے رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دو دور ہیں قبل بعثت کا چالیس سالہ دور اور بعد بعثت کا ۲۳ رسالہ دور قبل بعثت کے واقعات بھی اس لئے اہمیت

رکھتے ہیں کہ انسانیت کے سب سے بلند درجہ پر فائز افراد کو ہی نبوت کا منصب دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اصطفاء اور اجتباء جیسے الفاظ اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے بار بار استعمال ہوئے ہیں۔

مثلاً: اصْطَفٰی	5مرتبہ	اِصْطَفَیْتُ	1مرتبہ
اِصْطَفَیْنَا	2مرتبہ	یَصْطَفِی	1مرتبہ
مُصْطَفَیْنَ	1مرتبہ	اِجْتَبٰی	2مرتبہ
اجْتَبَیْنَا	2مرتبہ	یَجْتَبِیْ	3مرتبہ

انسان کے لئے نبوت کے مقام کو حاصل کرنا تو ناممکن ہے، البتہ وہ اعلیٰ انسانی درجے تک پہونچنے اور اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر دیکھنے کیلئے اگر کوشاں رہے تو یہ عین مطلوب ہے، اس کے لئے نمونہ وہی انسان کامل بن سکتا ہے جس کو نبوت اور حتمی طور پر خاتم النبیین قرار دے کر قیامت تک کے لئے نمونہ ڈکلیر کر دیا گیا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بے شمار واقعات پیش آئے، ہر واقعہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہاں محض چند واقعات اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے۔

ذرا یاد کیجئے اس وقت کو جب خانہ کعبہ کی تعمیر نو ہو رہی تھی۔ دیواریں اٹھ گئیں، چھت تعمیر ہوگئی، دروازہ بھی لگ گیا، مرحلہ آیا حجر اسود کی اس کی مخصوص جگہ پر تنصیب کا، حجر اسود جنت کا مقدس پتھر، عرب جاہلیت میں اس کے بارے میں کیا کیا باتیں مشہور تھیں، قریش اسے دیکھ کر نہال ہو ہو جاتے تھے، اس کو بوسہ دے کر دنیا کی بہت بڑی نعمت پالیتے تھے، اس کو چھونا خوش نصیبی کی علامت تھا، آج جو کوئی بھی اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر اس کو مقررہ جگہ پر رکھ دے گا، اس سے بڑھ کر خوش نصیب اور کون ہوسکتا ہے، دوسروں کو کیوں موقع دیا جائے، خود کیوں نہ یہ سعادت حاصل کرلی جائے، ہر دل میں یہی خواہش مچل رہی تھی، اس خواہش کو ہر ایک نے شرمندہ تعبیر کرنا چاہا تو تلواریں نکل آئیں، بھوئیں تن گئیں۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ سب لوگ حرم محترم میں رات گزاریں اور صبح سویرے جو شخص سب سے پہلے حرم محترم میں داخل ہوتا نظر آئے، صرف اسی کو یہ اعزاز حاصل کرنے کا موقع دیا

جائے، چنانچہ رات بھر انتظار کیا گیا، دلوں میں تجسس تھا کہ کون یہ اعزاز حاصل کرتا ہے؟ جب صبح طلوع ہونے کو آئی تو دیکھا گیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں داخل ہو رہے ہیں، ان پر نظر پڑتے ہی سب بول پڑے: یہ تو محمد ہیں، ان کی امانت وصدق کے ہم شاہد رہے ہیں، اس مقدس نعمت سے سرفراز کئے جانے کیلئے ان سے بہتر کوئی دوسرا فرد نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ کے سامنے صورت حال رکھی گئی، اور اس خدمت کو انجام دینے کی دعوت دی گئی۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس پر غور کرتے چلیں کہ حرم میں صبح سویرے سب سے پہلے داخل ہونا دوسروں کے لئے بھلے ایک اتفاق ہو سکتا ہے، کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ محض ایک اتفاق تھا؟ اس کا کیا جواب ہوگا؟ یہی نا کہ ہاں، یہ بھی ایک اتفاق تھا، لیکن یہ بات درست نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو روز ہی حرم میں فجر کے وقت پہونچنے کے عادی تھے، جو فرد بھی اس طرح کی کسی بھی اچھی عادت کا حامل ہوگا۔ اس حسن اتفاق سے ہم کنار ہونے کی سعادت بھی اسی کو حاصل ہوگی۔ ہم حسن اتفاق کے طالب رہتے ہیں، لیکن اس کا اہل بننے کیلئے اچھی عادت کا حامل بھی بننا پڑتا ہے اور یہ ہم سے ممکن نہیں ہوتا ہے۔

پھر آیئے اصل واقعہ کی طرف، جب آنحضرت کے سامنے مسئلہ رکھا گیا تو آپؐ چاہتے تو اس موقع کو غنیمت جان کر تنہا ایک بہت بڑا اعزاز حاصل کر لیتے۔ تنگ نظر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں لیکن آپ نے دوسری تدبیر اختیار کی، اپنی چادر مبارک زمین پر بچھائی، اس پر حجر اسود کو رکھا اور پھر حاضرین کو دعوت دی کہ وہ اس چادر کو اجتماعی طور پر حجر اسود کے لئے مخصوص مقام تک لے جائیں، کہا جاتا ہے کہ ''دل بدست آور کہ حج اکبر است'' آپؐ نے اس کی عملی مثال پیش کر دی اور خود آگے بڑھ کر حجر اسود کو اس کی متعین جگہ پر نصب کر دیا۔ تالیف قلب کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے، ہمارے سامنے کسی اعزاز کو تنہا حاصل کرنے کے بار بار مواقع آتے ہیں، کیا ہم اس اعزاز میں دوسروں کو بھی شریک کرنے کے روادار ہوتے ہیں؟ حضرت محمد ﷺ نبوت سے پہلے بھی اعلیٰ انسانی اوصاف کے حامل

تھے، جب پہلی وحی نازل ہوئی، اس وقت آپ ۴۰ رسال کے ہو چکے تھے، ۲۵ رسال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے آپ کا نکاح ہوا تھا، ازدواجی زندگی کے ۱۵ رسال بیت چکے تھے، یہ مدت کم نہیں ہوتی ہے، خاص طور پر بیوی کے لئے، اس کے سامنے شوہر کے اچھے برے سارے پہلو کھل کر آ چکے ہوتے ہیں، ہنگامی حالات میں بیوی ان پہلوؤں کے زیر اثر گفتگو کرنے سے بھی نہیں چوکتی ہے لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی تو غیر متوقع صورت حال سے متفکر ہو گئے، گھر پہونچے تو نڈھال سے تھے، بستر پر دراز ہو گئے، تھوڑا افاقہ ہوا تو اہلیہ سے سارا ماجرا کہہ سنایا، خوف واندیشہ کے ملے جلے تاثرات بے ساختہ زبان پر آ گئے، حضرت خدیجہؓ نے اس وقت جو الفاظ کہے ہیں وہ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں، ایسے مواقع پر رفیقۂ حیات کی زبان سے صادر ہونے والے الفاظ حقائق کی نشان دہی کرتے ہیں، یہ الفاظ ازدواجی زندگی کے سارے تجربات کا نچوڑ ہوتے ہیں، ملاحظہ کیجئے حضرت خدیجہؓ نے فرمایا:

كلا والله مايخزيك الله ابدا انك لتصل الرحم وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقرى الضيف وتعين على نوائب الحق فلا يسلّط اللّٰه عليك الشياطين والاوهام ولا مراء أن اللّٰه اختارك لهداية قومك۔

(قطعاً نہیں! بخدا اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کی رسوائی کا سامان نہیں کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان کی خبر گیری کرتے ہیں، غریبوں کی دست گیری کرتے ہیں، حوادث ومصائب میں لوگوں کے کام آتے ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کا رب آپ کو شیطان کے حوالے کر دے اوہام کا شکار بنا دے (یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آپ کی قوم کے نجات دہندہ کے طور پر منتخب فرمالیا ہے۔)

یہ محض چند الفاظ نہیں ہیں بلکہ آپ کے اخلاق واوصاف محاسن کا اعتراف بھی

ہے، ان اخلاق کے حوالہ سے آپ ﷺ کو تسلی دی گئی کہ کسی خوف و اندیشہ میں مبتلا نہ ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ جو کچھ ہوا ہے، آپؐ کو بلند مرتبہ پر فائز کئے جانے کا پیش خیمہ ہے، رشتہ داروں کے حقوق کی رعایت، ان کے ساتھ حسن سلوک، ان کے لئے کسی قسم کی قربانی کی ضرورت پیش آجائے تو اس سے کوئی دریغ نہ کرنا مفلسوں اور محتاجوں کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا، مہمانوں اور مسافروں کی خبر گیری کرنا، ان کی خدمت کے لئے ہر وقت مستعد رہنا، حق و انصاف کے معاملے میں کسی مداہنت کو راہ نہ دینا جیسے اوصاف کا حامل فرد ہمیشہ پروردگار عالم کی نگاہ میں رہتا ہے، خود پروردگار عالم اس کے محافظ بن جاتے ہیں، شیاطین کے شر و مکر سے اس کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے ہیں بلکہ ایسا شخص تو اس قابل ہوتا کہ وہ اللہ کی طرف سے نبوت و رسالت کے مقام بلند پر فائز کیا جائے، یہ اوصاف آج بھی جس فرد میں پائے جائیں گے وہ اگرچہ نبوت کے مقام پر فائز نہیں ہوسکتا اس لئے کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ البتہ اللہ کی نظر میں اس کا مقام بلند ضرور ہو جائے گا۔ اس حقیقت کو قرآن میں "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اے لوگو! اگر تم اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرلو، صحیح معنوں میں مومنین بن جاؤ، تو تم بھی اعلون بن سکتے ہو یعنی دنیا و آخرت میں ممتاز مقام حاصل کر سکتے ہو۔

حضرت خدیجہؓ کے ان مذکورہ اعترافات سے ہم سرسری طور پر گذر جاتے ہیں اور محض لطف بیان کے لئے ان کا حوالہ دیتے ہیں، ان میں افادیت کے جو پہلو ہیں ان سے صرف نظر کئے رہتے ہیں۔ نبوت سے پہلے بھی محمد کی شخصیت بے نظیر و بے مثال تھی۔ نبوت و رسالت کے ذریعہ ان کی مثالی حیثیت پر مہر لگ گئی اور اس کو سارے عالم کے لئے اسوہ کی حیثیت دیدی گئی۔ سیرت طیبہ کا یہ افادی پہلو ہے، عصر حاضر میں بھی اس کی افادیت برقرار ہے، اس پہلو کو اجاگر کرنے اور اس کو اقوام عالم کے سامنے رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم خود اس کے حامل بنیں، تاکہ ہمارے قول و فعل میں مطابقت پیدا ہو۔

تیسرا واقعہ سفر طائف کا ہے:

مکہ مکرمہ میں جب حالات ناگفتہ بہ ہو گئے تو خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت وتبلیغ کیلئے طائف جانے کا فیصلہ کیا، طائف میں آپ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا آج بھی وہ رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے، طائف کے لوگوں نے آپؐ کی دعوت کو نہ صرف ٹھکرا دیا بلکہ آپ پر پتھروں کی بارش برسادی یہاں تک کہ آپؐ کے مبارک قدم خون سے تر ہو گئے، اس وقت آپؐ نے جو دعا کی ہے کیا اس سے بہتر اور اس سے زیادہ مؤثر الفاظ میں اپنا دردِ دل بیان کیا جا سکتا ہے؟ دل کی ترجمانی کے لئے اس سے بہتر الفاظ نہیں ہو سکتے ہیں، سفر طائف کا نقشہ اپنے سامنے رکھئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے شکستہ دل اور خون آلود پاؤں کو ذہن میں رکھئے، غربت، مظلومیت اور بے کسی و بے بسی کے اس منظر کو یاد کیجئے اور آپ بھی اگر انہیں جیسے حالات کا شکار ہوں کہ ہر طرف مایوسی ہو، کوئی راستہ دکھائی نہ دے رہا ہو تو اس دعاء کو انتہائی عاجزی و دردمندی سے زبان پر لے آیئے، یقیناً آپ کی فریاد بھی سنی جائے گی۔

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّةَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ، اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعِفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَّتَجَھَّمُنِیْ اَمْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ؟ اِنْ لَّمْ یَکُنْ بِکَ عَلَیَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِیْ وَلٰکِنْ عَافِیَتُکَ ھِیَ اَوْسَعُ لِیْ اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمَاتُ وَصَلَحَ عَلَیْہِ اَمْرُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ مِنْ اَنْ تُنْزِلَ بِیْ غَضَبَکَ اَوْ یَحِلَّ عَلَیَّ سَخَطُکَ، لَکَ الْعُتْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِکَ۔

(خداوندا میں تیرے حضور ہی اپنی بے بسی و کمزوری کا شکوہ کرتا ہوں اور لوگوں کی نظر میں اپنی بے وقعتی کا شکوہ کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین

تو سارے ہی کمزوروں کا رب ہے اور میرا بھی رب تو ہی ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو مجھ سے درشتی کے ساتھ پیش آئے یا کسی دشمن کے حوالے جس کو تو نے مجھ پر قابو پالینے کا حق دے دیا ہے۔ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے کسی مصیبت کی پرواہ نہیں، مگر تیری عافیت ہی میں میرے لئے زیادہ کشادگی ہے، میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے اس نور کی جو اجالا کرتا ہے اندھیرے میں اور دنیا کے معاملات کو درست کرتا ہے، اور آخرت کے، مجھے اس سے بچالے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا میں تیرے عتاب کا مستحق ہو جاؤں تیری مرضی پر راضی ہوں یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ کوئی طاقت تیرے بغیر نہیں۔ (الکلم الطیب)

یہ ایک پیغمبر کی زبان سے اپنے رب کے حضور میں داد و فریاد کے الفاظ ہیں، مگر اس میں مومنانہ مزاج کی کمال رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، آج ہم بھی مسائل و مصائب کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور اس کی توجیہ اپنے اپنے مزاج و انداز کے مطابق گڑھتے رہتے ہیں، لیکن اللہ کی رضا اور عدم رضا کے امکان پر کما حقہ متوجہ نہیں ہوتے۔ رسول اکرم ﷺ کے ان الفاظ پر توجہ دیں: ''اِنْ لَّمْ یَکُنْ بِكَ عَلَیَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِیْ'' (اے اللہ اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں، حالیہ مصیبت آپ کے غیض و غضب کی وجہ سے نازل نہیں ہوئی ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل مسئلہ مصائب و مشکلات کا نہیں ہیں بلکہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے ناراض نہ ہو، بندوں سے کوئی ایسا فعل صادر نہ ہو جو اللہ کی ناراضگی کا باعث بن جائے۔ مشکلات و مصائب معمولی چیزیں ہیں، سب کے ساتھ پیش آتی ہیں، اور انسان کی آزمائش ایسے ہی ناگفتہ بہ حالات میں ہوتی ہے۔ مومن اس فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کہیں اللہ رب العزت کے حضور میں کوئی ایسی گستاخی سرزد نہ ہو جائے جو اس کو ناراض کرنے کی موجب بن جائے، یہ جذبہ ہی اصل ایمان ہے، یہ جذبہ آدمی کو طاقت ور بنا دیتا ہے، حالات کا مقابلہ کرنے اور مصائب کے سامنے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ

بخشتا ہے۔ کیا ہم اس ایمان کے حامل ہیں؟

عید میلاد النبی کی مناسبت سے ہم جلسے منعقد کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، کروڑوں افراد جوش وخروش کے ساتھ اس میں شرکت بھی کرتے ہیں، اگر کروڑوں کا یہ جم غفیر سیرت طیبہ کی روشنی میں کوئی تعمیر واصلاحی مہم بھی شروع کردے، مثلاً اس تاریخ میں غریب غرباء کا جائزہ لیں، بیواؤں کی کفالت، کنواری بچیوں کی شادی کی تعمیل کا سامان فراہم کردیں، افلاس کے باعث تعلیم سے محروم رہ جانے والے بچیوں کے تعلیمی اخراجات مہیا کرنے اور کرانے کی مہم چلائیں، اس کے لئے کسی اضافی رقم کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ جو رقم ان تقریبات کے بہانے خرچ کی جاتی ہے وہ مذکورہ تمام ضروریات کی تکمیل کے لئے کافی ہوسکتی ہے عوام وخواص کو توجہ دلانے کی ضرورت ہے ورنہ سیرت طیبہ کی عصری افادیت کے سارے عنوانات کاغذ کی زینت بنے رہیں گے۔

عالمی نظام اور سیرت نبویؐ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن تعلیمات کو لے کر مبعوث کیے گئے وہ ایسی ہمہ گیر اور کامل و اکمل ہیں کہ رہتی دنیا تک ان سے رہنمائی ملتی رہے گی، زمانہ چاہے کتنا ہی ترقی کیوں نہ کر جائے مگر وہ تعلیمات نبویہؐ سے دست بردار نہیں ہوسکتا، کیوں کہ قرآن کا اعلان ہے: ''میں نے آج تمہارے دین کو کامل و مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا اور دین اسلام کو تمہارے لیے پسند کر لیا۔'' (المائدہ:۳)

اس آیت کریمہ میں غور کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ قرآن نے دو جملے استعمال کیے ہیں: اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت۔ بظاہر دونوں ایک معلوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اکمال دین کا جملہ لا کر بنی آدم کو صاف الفاظ میں خبر دے دی کہ اس دین کے آنے کے بعد تمام ادیان سابقہ منسوخ ہو چکے ہیں، اس لیے کہ بقیہ زمانہ میں جو شریعتیں اللہ کی جانب سے انبیاء سابقین کے ذریعہ بنی نوع انسانی پر نازل کی گئی تھیں، وہ اس زمانہ کے لحاظ سے تھیں مگر نبی آخر الزماں احمد مصطفیٰ محمد مجتبیٰ ﷺ کو جو شریعت دی گئی، وہ صرف ان کے زمانہ کے ساتھ خاص نہیں، وہ ایسی کامل و مکمل ہے، کہ ہر زمانہ میں اللہ کی رضا جوئی والی راہ جاننے کے لیے کافی اور وافی ہے۔ اور دوسرا جملہ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ یعنی اور یہ کہ میں تم پر اپنی نعمت کو مکمل کر چکا ہوں تو ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد نعمت رسالت ہو، یعنی اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا، اور ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد بندوں کو یہ بتانا ہو کہ اسلام جو مادہ پرستی کے دور میں انسان کے لیے شاق معلوم ہوگا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اسلام اللہ کی ایک نعمت عظیم ہے، جس میں اعتدال ہے، لہٰذا وہ ضرورت زمانہ کے نام سے کسی طرح کی تحریف و تغیر کا حامل نہیں

ہوسکتا، بلکہ وہ اب قیامت تک قرآن وحدیث کے بیان کردہ خطوط واصول پر قائم رہے گا۔
نیو ورلڈ آرڈر کے نام سے دنیا میں برپا کئے جانے والے فتنے کا تعاقب کرتے ہوئے یہ دیکھنے کی کوشش کرنے کی ضرورت ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کے مطالبات کیا ہیں، اور اسلام میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اس کا حل کیا ہے؟

نیو ورلڈ آرڈر:

۱۸۹۷ء میں یہودیوں نے اپنی ایک کانفرنس میں نیا عالمی نظام (New World Order) کا تخیل پیش کیا، اور اس کی تشکیل کی پہلی کوشش ۱۹۱۷ء میں کی گئی۔ جب امریکی صدر ولسن کے مشیر کرنل مناڈیل ہاؤس نے اقوام متحدہ (لیگ آف نیشنز) کا خاکہ ولسن کے سامنے پیش کیا، اگرچہ اس وقت یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ ''امریکی مقتدر اعلیٰ کسی تنظیم کے تابع نہیں رہ سکتا'' ایسا اس لیے ہوا، کہ یہود اب تک اپنا اثر ورسوخ امریکی اداروں پر قائم نہیں کر سکے تھے، مگر پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب اقتدار تک پہنچ کر ہی کچھ کام بن سکے گا، لہٰذا اس کے لیے وہ سرگرم ہو گئے، اور ۱۹۴۱ء کے آنے تک تمام امریکی حکومتی اداروں پر حاوی ہو گئے، یہاں تک کہ یکم جنوری ۱۹۴۲ء کے آنے تک اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آ گیا اور یہیں سے نیو ورلڈ آرڈر کی بنیاد پڑ گئی، پھر اس شر انگیز فتنہ نے دنیا میں کیا خلفشار پھیلایا، حالات اس کے گواہ ہیں کہ پوری دنیا برائی کے جہنم میں دھکیل دی گئی اور ظاہری و باطنی سکون دنیا سے عنقا ہو گیا، لہٰذا اب جب تک اسوۂ رسول کا احیا نہیں ہو جاتا امن اور خیر کی فضا قائم نہیں ہو سکتی۔

دنیا کے حالات دیکھ کر ہر شخص خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ دہشت گردی مٹانے کے نام پر پوری دنیا میں کون دہشت گردی برپا کئے ہوئے ہے؟ ظاہر ہے کہ امریکہ ہی ہے، اور کیوں نہ ہو؟ امریکہ کی بنیاد ہی سو ملین ریڈ انڈین کے قتل ناحق پر پڑی! اور پھر وقفہ وقفہ سے انسانی خون ہی کے ذریعہ اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا گیا ہے اور آج اس کی اس تعمیر کے بعد اس آہنی بقاء کے لیے بھی اس کو انسانی ناحق خون ہی درکار ہے! مگر امریکہ یہ بھول چکا ہے،

کہ دیر آید درست آید، اللہ کا عذاب بغتۃ اچانک آتا ہے، اور جب آجائے گا" ولا یجدون لهم من دون الله ولياً ولا نصيرا "اور اللہ کا قانون ہے" وما للظالمين من انصار " ظالمین کا کوئی مددگار نہ ہوگا، نئے عالمی نظام کا جنم داتا چوں کہ امریکہ بن بیٹھا ہے لہٰذا مختصراً اس محرک کا ذکر ضروری تھا۔

نئے عالمی نظام کے عناصر ترکیبیہ :

نئے عالمی نظام کے عناصر ترکیبیہ تو بہت ہیں، مگر امت مسلمہ پر جن عناصر کے ذریعہ ظلم کیا جارہا ہے۔ صرف انہی کو یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔ عالمگیریت (Globalisation) کا مطلب عمومی طور پر پوری دنیا کو ایک ہی نظام کے تحت کرنا ہے، یعنی معاشی تعلیمی، اخلاقی، تہذیبی، ہر چیز میں مغرب کا مقلد محض کر دیا خاص طور پر عالم اسلام کو، کیوں کہ وہ جانتا ہے، کہ اگر ہمارا کوئی ہم سر اور مدمقابل ہے تو وہ اسلام ہی ہے۔ کیوں کہ مغربیت اور اسلامیت میں تضاد ہے، اس لیے کہ مغرب مادہ پرست ہے اور اسلام اللہ پرست ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ

جولوگ اخبارات ورسائل پڑھتے ہیں اور میڈیا اور انٹرنیٹ سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ آج اسلام کے خلاف ایک طوفان برپا ہے۔ ہر پہلو سے اسلام اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے۔ ابھی سال دو سال پہلے تک کہا جاتا تھا کہ اسلام کی تعلیمات تو صحیح ہیں، اُن میں کوئی بڑی قابل اعتراض بات نہیں ہے البتہ مسلمانوں میں فلاں شخص غلط ہے، تشدد پسند اور دہشت گرد ہے اور غلط اقدامات کر رہا ہے۔ کبھی کسی جماعت کا نام لیا جاتا تھا کہ فلاں جماعت، فلاں تنظیم تشدد پسند اور دہشت گرد ہے۔ دہشت گردی پھیلا رہی ہے، اس کا وجود خطرناک ہے، اسے ختم کر دینا چاہئے۔ مگر اب بات اس پر نہیں رکی ہے بلکہ براہ راست اسلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہی کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ اب صاف صاف کہا جارہا ہے کہ ''اسلام تشدد کی تعلیم دیتا ہے، دہشت گردی پر ابھارتا ہے، وہ مخالفین کو برداشت نہیں کرتا اور زبردستی اپنی بات دوسروں سے منوانا چاہتا ہے اور طاقت کے بل پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے۔ باہم گفتگو تبادلہ خیال اور سمجھنے سمجھانے کا راستہ اس نے اختیار نہیں کیا ہے، بلکہ طاقت کے زور پر اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔ جب تک اسلام روئے زمین پر ہے، دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا اور یہی تعلیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ ان کی تعلیمات میں اور سیرت وسوانح میں تشدد کا پہلو موجود ہے۔ انہوں نے اپنے مخالفین کو برداشت نہیں کیا بلکہ بزور ان کو ختم کیا۔'' وغیرہ وغیرہ۔

اسلام کی یہ تصویر سراسر واقعہ کے خلاف ہے۔ یہ اعتراضات گو بہت شدت سے اٹھائے جارہے ہیں۔ لیکن نئے نہیں ہیں۔ جب قرآن شریف نازل ہوا اور رسول خدا ﷺ

نے اسے دنیا کے سامنے پیش کیا تو اس وقت بھی اسی طرح کے اعتراضات کئے جارہے تھے۔ کہا گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو راستہ دکھا رہے ہیں، اس سے ہمارے اندر انتشار پیدا ہو رہا ہے، آپ کی بات اگر مان لی جائے تو امن وامان اور سکون کی جو زندگی ہم گزار رہے ہیں وہ ختم ہو جائے گی۔ آپ کی باتوں پر اگر عمل ہو تو ممکن نہیں کہ ہم اس دنیا میں رہ سکیں، ساری دنیا ہماری مخالف ہو جائے گی۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ آپ جب بھی کسی فکر پر کسی نظریہ پر تنقید کریں گے اور اسے غلط کہیں گے تو اسے وہ آسانی سے برداشت نہیں کرسکتا اور نہ دنیا کا کوئی فکر ایسا ہے کہ وہ آسانی سے اپنی جگہ چھوڑ دے اور کہے کہ آیئے اور اپنے نقطہ نظر پر عمل کیجئے، یہی صورت حال اس وقت بھی تھی۔ ظلم چاروں طرف ہوتا رہا اور اس پر پردہ ڈالنے کے لئے نبی ﷺ کو ظالم قرار دیا جاتا رہا۔ ان کے یہاں عورتوں پر ظلم ہو رہا تھا، یتیموں پر ظلم ہو رہا تھا، ناداروں پر ظلم ہو رہا تھا، ہر کمزور پر ظلم ہو رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں، دنیا میں کمزوروں کا کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ طاقتور سمجھتا ہے کہ سارے حقوق اس کے ہیں۔ اسلام نے کمزوروں کے حق میں آواز بلند کی۔ اس نے شروع ہی سے کہا کہ ان کمزوروں پر ظلم نہیں ہوسکتا۔ عورتوں پر ظلم نہیں ہوسکتا، یتیموں پر ظلم نہیں ہوسکتا۔ ناداروں پر ظلم نہیں ہوسکتا، مسکینوں اور محتاجوں پر ظلم نہیں ہوسکتا۔ تمہارے پاس جو غلام ہیں، ان پر ظلم نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ کمزوروں پر ظلم کر رہے تھے، انہیں یہ چیز کیسے برداشت ہوتی؟ وہ اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ اس وقت بھی یہی صورت حال ہے۔ ظالم دوسروں پر ظلم کر رہا ہے اور الزام آپ پر لگا رہا ہے کہ آپ ظلم کر رہے ہیں۔

طاقتور قومیں دہشت گردی کا ارتکاب کر رہی ہیں اور آپ پر الزام لگایا جارہا ہے کہ آپ دہشت گرد ہیں۔ دہشت گردی کی تعلیم دیتے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ حالانکہ اسلام تو اس لئے آیا ہے کہ دنیا سے ظلم ختم ہو اور ہر ایک کو انصاف ملے۔ قرآن نے اس معنی میں کہا کہ ''اے اللہ کے رسول! ہم نے آپ کو ساری دنیا کے لئے سراسر رحمت بنا کر بھیجا ہے اور رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

یہ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے۔ آپ ﷺ نے جو کتاب دنیا کے سامنے پیش کی اس کے متعلق کہا گیا: ''یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے صحیح اور سب سے مضبوط ہے۔'' اس قرآن کی اتباع کرنے والا آدمی کبھی گمراہ نہیں ہوسکتا۔ جو کتاب سیدھا راستہ دکھاتی ہے، افسوس کہ تم اس کی مخالفت کررہے ہو۔ اگر تمہارے پاس اس سے سیدھا راستہ ہو تو لاؤ اسے پیش کرو، قرآن نے کہا کہ یہ نبی بھی رحمت ہے، اور وہ جو راستہ دکھا رہا ہے، اسی میں تمہاری نجات ہے۔ اس راستہ کے اندر کسی خامی کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہاں غلطی ہوئی ہے۔ وہ سیدھا جنت تک پہنچانے والا راستہ ہے اور دنیا میں بھی کامیابی سے ہمکنار کرنے والا راستہ ہے۔ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو دلیل کے لحاظ سے بھی سب سے مضبوط ہے اور منزل تک پہنچانے والا ہے۔

تم کہتے ہو کہ قرآن کے ذریعہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ظلم پھیل رہا ہے اور خون ناحق بہہ رہا ہے۔ حالانکہ قرآن اس لئے آیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے آئے ہیں کہ دنیا سے ظلم ختم ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''الظلم ظلمات یوم القیامۃ''۔

آدمی سمجھتا ہے کہ میں نے ایک زیادتی کی ہے۔ نہیں، وہ ایک زیادتی نہیں ہے بلکہ ہزار زیادتیاں ہیں۔ ایک ظلم کے نتیجہ میں ہزار تاریکیاں کھڑی ہو جاتی ہیں اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''ظلم تاریکیاں ہیں''۔ جس ہستی کی یہ تعلیم ہو کہ وہ ظلم کو ظلمت اور تاریکی کہے بلکہ تاریکیاں قرار دے، اس کو کہا جارہا ہے کہ یہ ظلمت پھیلا رہا ہے۔ نعوذ باللہ۔ انسان کا ایمان سلب ہو جائے اگر کسی کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ آپ دنیا کو ظلمت دکھانے آئے تھے۔ رشتہ داروں پر ظلم ہو، اپنوں پر ہو، غیروں پر ہو۔ دوسرے مذہب والوں پر ہو۔ کسی بھی مذہب والے پر ہو، اگر وہ ظلم ہے تو ظلم کرنے والا ظالم ہوگا اور تاریکی پھیلانے والا ہوگا۔

ایک حدیث قدسی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کہتا ہے: میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دے لیا ہے، لہٰذا تم بھی ظلم نہ کرو۔ اسلام تو اس لئے آیا ہے

کہ وہ ظلم کو برداشت نہ کرے، وہ ظلم پھیلانے کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ ظلم کو مٹانے کے لئے آیا ہے۔ وہ ظلم کی تعلیم دینے نہیں آیا ہے بلکہ یہ بتانے آیا ہے کہ دنیا میں کسی پر ظلم نہیں ہونا چاہئے۔ اس پر ظلم اور تشدد کا التزام وہی شخص لگا سکتا ہے جو اس کی تعلیم سے بے خبر ہے یا دنیا کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔

قرآن نے ہر انسان کو اور نوع انسانی کے ہر فرد کو باعزت اور محترم قرار دیا۔ اس کی عظمت کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ ارشاد ہے:

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا" (بنی اسرائیل ۷۰)

مطلب یہ کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے۔ اس کا ایک ایک فرد محترم اور قابل احترام ہے۔ اس کی اس حرمت پر حرف نہیں آنا چاہئے۔ فرمایا: "وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" (ہم نے ان کو یہ قوت اور طاقت دی ہے کہ خشکی میں چل سکتے ہیں، سمندر میں تیر سکتے ہیں، ہوا میں اُڑ سکتے ہیں۔ بحر و بر سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت دی ہے)۔ "وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ" (پاکیزہ چیزیں کھانے کو دی ہیں)۔ دنیا کی مخلوقات گندی چیزیں کھاتی ہیں لیکن انسان صاف ستھری اور پاک چیزیں کھاتا ہے۔ وہ جانوروں کی طرح گندی چیزیں نہیں کھاتا، بلکہ پاک اور صاف ستھری چیزیں کھاتا ہے۔ "وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا" (اور اولاد آدم کو بہت ساری مخلوقات پر فضیلت عطا کی)۔

قرآن کہتا ہے کہ انسان جسے بر و بحر سے فائدہ اٹھانے کی غیر معمولی صلاحیت حاصل ہے جو دوسری مخلوقات سے بہت برتر ہے اس کا ہر فرد محترم ہے اس کی عظمت کو داغدار نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کوئی شخص اس کی عظمت کو ختم کرنا چاہتا ہے تو وہ قرآن کی نگاہ میں مجرم ہے۔

قرآن نے کہا کہ ہر انسان کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ اس کے اس حق کو سلب کرنا ساری نوع انسانی کو حق حیات سے محروم کرنا ہے۔

وَمَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَّمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَی النَّاسَ جَمِیْعًا

(المائدہ:۳۲)

مطلب یہ کہ اگر کسی نے اپنے جیسے کسی انسان کو قتل کیا جب کہ اس نے کسی کا خون نہیں بہایا اور نہ معاشرہ میں فساد مچایا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا۔ اس لئے کہ کسی بے گناہ کو قتل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ دنیا کو یہ راستہ دکھا رہے ہیں کہ کسی بھی انسان کی جان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ بغیر کسی جرم کے بھی اس کی جان لی جاسکتی ہے۔ اسی طرح کسی بے گناہ کو بچانا اور اس کی جان کی حفاظت کرنا تمام انسانوں کو حیات کی سند فراہم کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ کسی بے گناہ پر ظلم نہیں ہوگا اور اس کی زندگی اس سے نہیں چھینی جائے گی۔

ایک اور موقع پر فرمایا: ''وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ''۔

مطلب یہ کہ ہر انسان محترم ہے۔ اسے زندہ رہنے کا حق ہے۔ اس کی جان لینے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ ہاں اگر حق وانصاف یہ کہہ رہے ہوں کہ وہ زندہ رہنے کا حق کھو چکا ہے تو بلاشبہ اس کی جان لی جاسکتی ہے۔ اس کا فیصلہ قانون کرے گا، عدالت کرے گی۔

آگے فرمایا: ''وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطَانًا فَلَا یُسْرِفْ فِی الْقَتْلِ اِنَّهٗ کَانَ مَنْصُوْرًا۔ (بنی اسرائیل:۳۳)

اگر کسی کو ناحق قتل کیا جاتا ہے اور وہ مظلوم مرتا ہے تو اس کے ولی کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ قاتل سے انتقام لے۔ اسے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ بے بس اور مجبور ہے۔ میرا باپ مارا گیا، میرا بچہ مارا گیا۔ میرا بھائی مارا گیا۔ میں کمزور ہوں۔ اس کا بدلہ نہیں لے سکتا۔ قرآن نے کہا کہ وہ کمزور نہیں ہے اس لئے کہ اسے اللہ کی طرف سے ''سلطان'' حاصل ہے۔ اس کے پاس دلیل ہے اور طاقت ہے۔ یہ طاقت سوسائٹی فراہم کرے گی اور حکومت فراہم کرے گی۔ اب اس کی ذمہ داری ہے کہ ''فَلَا یُسْرِفْ فِی الْقَتْلِ'' یہ سمجھ کر کہ میرے پاس دلیل ہے، ثبوت ہے، میرے ساتھ سماج ہے اور حکومت ہے، انتقام میں حد

سے آگے نہ بڑھے۔ اسے اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ قاتل کی جگہ دوسرے سے انتقام لے یا ایک کی جگہ دس کو تہہ تیغ کردے۔ آخر میں فرمایا ''اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا '' مقتول کا ولی کسی حال میں خود کو بے یار و مددگار نہ تصور کرے۔ اس کی مدد ہوگی۔

قرآن مجید نے یہ بات اس وقت کہی جب کہ اسلام اقتدار میں نہیں تھا اور کمزوروں کا خون بہہ رہا تھا۔ جب وہ اقتدار میں آیا تو اس کی قانونی تفصیلات بیان کیں اور ان پر عمل کیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا۔ لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا گیا۔ حالانکہ کوئی بھی شخص جو اسلام پر ایمان رکھتا ہے یہ حرکت نہیں کرسکتا۔ قرآن نے صاف کہا ہے ''لَا اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ ''۔ ہمارے فقہا نے لکھا ہے اور قرآن وحدیث کی بنیاد پر لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کو زبردستی مسلمان بنایا گیا ہو اور وہ کہے کہ مجھے زبردستی مسلمان بنایا گیا ہے تو اسے اجازت دی جائے گی کہ وہ اپنا سابقہ دین اختیار کرلے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ اب تم نے تو کلمہ پڑھ لیا ہے، لہٰذا اب مسلمان بن کر رہو۔ کوئی طاقت اسے اپنے سابقہ مذہب میں جانے سے روک نہیں سکتی۔ کسی کو زبردستی مسلمان بنانا صراحتاً ایک غلط اور ناروا عمل ہے۔ قرآن کہتا ہے: منافق کا درجہ کفار و مشرکین سے بھی بدتر ہوگا۔ ''اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا '' (منافقین کا ٹھکانہ جہنم کے نچلے طبقے میں ہوگا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا)۔

جو شخص دل سے مسلمان نہ ہو اور ظاہر میں مسلمان ہوجائے وہ منافق ہے، کیا کوئی ہوش مند مسلمان اس بات کی کوشش کرے گا کہ اپنے دائرہ کے اندر کوئی منافق آجائے۔ اگر کوئی شخص دل سے مسلمان نہیں ہے، صرف ظاہری طور سے مسلمان ہے اور دکھاوے کے لئے مسلمانوں جیسا عمل کر رہا ہے تو وہ منافق ہے۔ وہ حقیقت میں دشمن اسلام ہے۔ کیا اسلام اس بات کی تعلیم دے رہا ہے کہ اپنی صفوں میں منافقوں کو بھرلو، بے ایمان لوگوں کو لے آؤ؟ کیا ایسے لوگوں سے کسی خیر کی توقع کی جاسکتی ہے؟

ایک مرتبہ مجھ سے ایک شخص نے کہا کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ یہاں تلوار کے

زور سے لوگوں کو مسلمان بنایا گیا۔ میں نے عرض کیا۔ اس طرح کے واقعات کو میں تسلیم نہیں کرتا۔ یہ عقل عام کے خلاف ہے کہ کسی کو زبردستی اسلام کے دائرے میں داخل کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی واقعہ سچا ہے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ جس نے یہ کیا غلط کیا، خواہ وہ کتنے ہی بڑے بادشاہ نے کیا ہو یا کتنے ہی بڑے صاحب اقتدار نے کیا ہو۔ جس نے بھی کیا غلط کیا اور اسلام کی تعلیم کے خلاف کیا۔

اسلام پر اعتراضات کا ایک طویل سلسلہ ہے اور مختلف پہلوؤں سے اسے تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس پر حملے ہورہے ہیں اور آپ ﷺ کی تعلیمات کو فرسودہ بلکہ انسانیت کے لئے نقصان دہ ثابت کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ یہ کام مختلف ذرائع سے بہت بڑے پیمانے پر ہورہا ہے۔ اس مجلس میں الحمدللہ تعلیم یافتہ اصحاب ہیں۔ حالات سے باخبر ہیں۔ ایسے لوگ ہیں کچھ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سوچیں کہ اس طوفان بدتمیزی کا کیسے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ فضائیں جن غلط باتوں سے گونج رہی ہیں ان کا کیسے جواب دیا جاسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ اس میں ہم اپنا حصہ ادا کرسکیں۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم
دنیائے انسانیت کیلئے مکمل مثالی عملی نمونہ

پیغمبر اسلام، رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت عالم انسانیت میں اپنی نوعیت کی واحد آدرش شخصیت ہے جس کے بارے میں پروفیسر کے ایس راما کرشنا راؤ سابق صدر شعبہ فلاسفی گورنمنٹ گرلز کالج میسور کا کہنا ہے: ''پیغمبر محمد ایک ایسے تاریخی حیثیت کے حامل واحد عظیم شخص ہیں جن کی زندگی کی ایک ایک حرکت کو بڑی احتیاط کے ساتھ صاف شفاف خالص شکل میں چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرلیا گیا ہے۔ آپ کی زندگی اور آپ کے کارنامے پراسرار پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ آپ کے بارے میں صحیح صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے کسی کو سر کھپانے اور بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سچے موتی حاصل کرنے کے لئے ڈھیر سارا بھوسا اڑا کر چند دانے پانے جیسی محنت اور جفاکشی کی ضرورت نہیں ہے۔''

آپ نے پیدائش سے لے کر ۶۳ رسال کی عمر تک ایک مکمل انسان کی ہمہ جہتی سرگرمیوں سے بھرپور زندگی گزاری۔ جس میں آپ طفل شیر خوار بھی ہیں در یتیم بھی ہیں کہ پیدائش سے پہلے ہی باپ کے سایہ سے محروم ہوگئے۔ چھ سال کی عمر میں ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا، دادا نے دست کفالت بڑھایا تو دو سال بعد وہ بھی راہی ملک عدم ہو گئے۔ لڑکپن کے دور سے بھی گزرے۔ دور شباب بھی آیا۔ ازدواجی زندگی بھی اختیار کی۔ باپ بھی بنے، بکریاں بھی چرائیں۔ کاروبار بھی کیا۔ قافلوں کے ساتھ دور دراز کے اسفار بھی کئے۔ معاشرہ میں گھل مل کر بھی رہے لیکن ہر قدم پر اپنی امتیازی شان و شناخت بھی قائم

رکھی، کبھی نہ لہو ولعب میں مشغول ہوئے نہ برائیوں سے زندگی کو آلودہ کیا نہ اپنے کردار پر کبھی کوئی حرف یا داغ آنے دیا۔ دوستی بھی کی۔ تنازعات کے فیصلے بھی کئے۔ ہمیشہ لہو ولعب سے کوسوں دور رہے۔ صادق اور امین کی حیثیت سے اپنی خاص شناخت قائم کی۔ حسن تدبیر کا مظاہرہ بھی کیا۔ باہم مصالحت بھی کرائی۔ قاضی اور جسٹس کی حیثیت سے فیصلے بھی کئے، کمزوروں کو ان کا حق دلایا ظالموں کو ظلم وعدوان سے روکا۔ خلوت میں بھی رہے جلوت میں بھی نظر آئے۔ غلاموں کے آقا بھی تھے، رفقاء واصحاب کے دوست بھی تھے۔ نبوت کے مرتبہ اعلیٰ پر فائز ہوئے تو نصح خیر خواہی کو اپنا مشن بنایا۔ مخالفتوں کا سامنا بھی کیا دھمکیوں اور لالچ کے مراحل بھی آئے۔ مگر قدم نہ ڈگمگائے، پاؤں میں بھی کوئی لغزش نہ آنے دی۔ پتھروں اور گالیوں کے جواب میں دعائیں دیں۔ اذیتیں برداشت کیں، زخموں سے چور ہوئے جوتے خون سے بھر بھر گئے، بائیکاٹ اور مقاطعہ کے مراحل سے گزرے گھر سے بے گھر ہوئے جلاوطنی بھی برداشت کی۔ آپ ﷺ کو جنرل کمانڈر کی حیثیت بھی حاصل ہوئی اللہ کے رسول اور حکمراں کا درجہ بھی ملا۔ آپ ﷺ نے سیاست بھی کی، وعظ ونصیحت اور تقریریں بھی کیں۔ اصلاح معاشرہ کے اصول بھی دنیا کے سامنے پیش کئے اور اپنے اصولوں کو عملی شکل دے کر مثالی معاشرہ بھی قائم کیا۔ آپ یتیموں کے مربی بھی تھے۔ غلاموں کے محافظ بھی، عورتوں کو حقوق اور مقام ومرتبہ عطا کرنے والے بھی اور ہر میدان میں محض اصول ونظریہ دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہر اصول ونظریہ کو معاشرہ وسوسائٹی میں عملاً نافذ بھی کیا۔ کردار کی بلندی کا وہ نمونہ پیش کیا کہ دشمنوں نے بھی عظمت کا اعتراف کیا اور کہیں کسی نے انگشت نمائی کا موقع نہ پایا۔ عابد وزاہد ایسے کہ مسلسل روزے رکھے جارہے ہیں اور دوسروں سے فرمارہے ہیں ''تم میری ہمسری نہ کرسکو گے کہ میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ نماز میں قیام اتنا طویل کہ ٹانگوں اور پیروں پر ورم آجاتا۔ ایک ایک آیت پڑھتے اور روتے ساری رات گزر جاتی۔ سجدے میں چلے جائیں تو رفیق حیات کو اندیشے لاحق ہو جاتے۔ سراپا عاجزی وانکساری تھے۔ ساتھ ہی وقت کے جباروں وقہاروں کو بھی للکارتے تھے۔

عقائد اور مالی و بدنی عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوۃ تسبیحات و دعاؤں کا مکمل نصاب پیش کر دیا۔ اسلام کے احکام و تعلیمات، مسائل و تشریحات بیان کئے۔ احسان کا مفہوم بتایا کہ اس طرح عبادت کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اگر ایسا تصور قائم نہ کر سکو تو یہ حالت ضرور اختیار کر لو کہ تمہیں اللہ دیکھ رہا ہے۔ ایمان کے ستر شعبے قرار دیئے اور راستہ سے اذیت دینے والی چیز کو ہٹانے اور حیا کو بھی اس کے شعبوں میں قرار دیا۔ اپنے سچے پیروکار کی خاص شناخت یہ قرار دی کہ ان کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ و سالم رہیں۔ اللہ کے لئے محبت اور اللہ ہی کے لئے بغض و عداوت کے اصول کی تعلیم دی ''الحب فی اللہ والبغض فی اللہ، اَعۡطَیٰ لِلّٰہ ومنع للہ'' کو کمال ایمان قرار دیا اور مومن کی پہچان بتائی کہ جس سے لوگوں کے خون اور اموال مامون ہوں۔ امانت اور عہد کی پابندی کو دین اور ایمان کے لئے لازمی قرار دیا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینے والے پر جہنم کی آگ کے حرام ہونے کی بشارت دی اور شرک سے دامن بچا کر زندگی گزارنے والے کو جنت کی خوشخبری دے دی۔ لا الہ الا اللہ کو جنت کی کنجی قرار دیا اور خلق حسن کو افضل ایمان قرار دیا۔ دوسروں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور دوسروں کے لئے بھی وہ ناپسند کرو جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو'' کے زریں اصول کو بھی افضل ایمان قرار دیا۔ گھناؤنی انسانی اخلاقی برائیوں سے بچنے کا حکم فرمایا شرک، جادو، قتل، سود خوری، یتیموں کا مال کھانے دشمن کے مقابلہ سے فرار ہونے، نیک و پاک دامن خواتین پر اتہام لگانے کو مہلک جرائم قرار دیا۔ زنا، چوری، شراب نوشی دوسروں کا مال ناجائز طریقہ سے ہڑپنے، دھوکہ وفریب اور قتل کو ایسے سنگین کبیرہ گناہ قرار دیا کہ جن کے ارتکاب کے وقت آدمی مومن نہیں رہتا۔ جھوٹ بولنے، وعدہ خلافی، امانت میں خیانت اور گالی گلوج کو منافق کی علامت قرار دیا کہ چاہے کتنی ہی نمازیں پڑھ لے۔ کتنے ہی روزے رکھ لے خود کو خود اپنے دل میں کتنا ہی پکا سچا مسلمان سمجھتا رہے جب تک ان خصلتوں سے خود کو پاک و صاف نہ کر لے گا منافق ہی قرار دیا جائے گا۔ اس کی نماز روزہ اور مسلمان سمجھنا کسی کام نہ آوے گا اور اس طرح معاشرہ کی اصلاح کی اور اس کو امن و امان تحفظ و سلامتی باہمی میل جول اور اخوت و

محبت کی ٹھوس بنیادیں فراہم کیں۔ تقدیر پر ایمان کو لازمی قرار دے کر صبر و قناعت کے لئے ذہن سازی کی۔ حسد سے بچنے کی تلقین کی اور حاسد کے حسد سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کی تعلیم دی کہ اللہ نے جو کچھ تقدیر میں لکھ دیا ہے وہی ملے گا اور وہ مل کر ہی رہے گا اب اس کو جس طرح چاہے لے لو۔ جائز و حلال کر کے لو یا ناجائز و حرام کر کے۔ دوسروں کا حق مار کے لو یا پیسہ پیسہ جوڑ کر ذخیرہ کر لو دولت کے انبار و ڈھیر لگانے کی کوشش کر لو۔ حرص و لالچ، بخل و کنجوسی کو اپنی شناخت بنا لو یا ایثار و قربانی دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینے اپنے لئے حق سے کم پر راضی ہو جانے، زکوۃ صدقہ و خیرات اور جود و سخا کو اپنا شیوہ بنا لو، اللہ کے حاضر و ناظر قبر کے سوال و جواب اور آخرت کے حساب کتاب کو اسلام کا بنیادی عقیدہ قرار دے کر چوری چھپے برائی گناہ و جرم کے ارتکاب کا سد باب کر دیا کہ ''نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد'' نیز ''اِنَّ اللّٰه کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا'' کی آیتیں سنا کر اور دل میں پیدا ہونے والے وسوسہ تک سے اللہ کو باخبر قرار دے کر ایک نہ نظر آنے والی آنکھ اور کبھی غافل نہ ہونے والے نگراں کی خبر دے کر غلط خیال و برا وسوسہ تک دل و دماغ میں پیدا نہ ہونے دینے کا سامان فراہم کر دیا اور ''اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ'' کی بشارت سنا کر امید و رجا اور اطمینان قلب کے لئے بیش قیمت سرمایہ عطا فرما دیا۔

بلاشبہ خیر الحدیث کتاب اللہ اور خیر الہدی ہدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے یہ ہمارے ایمان و عقیدہ کا سوال ہی نہیں بلکہ ثابت شدہ مسلمہ حقیقت ہے۔ آپ کے دل میں ہر وقت تمام مخلوق خدا بالخصوص نوع بنی آدم کی فلاح و بہبود کا سودا سمایا رہتا تھا کہ آپ ﷺ کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ کا الاؤ روشن کیا جب اس سے ارد گرد کی ہر چیز روشن ہو گئی اور کیڑے مکوڑے چھوٹے بڑے جاندار اس میں آ کر گرنے لگے تو وہ انہیں روکنے لگا مگر وہ اس پر غالب آئے اور جھنڈ کے جھنڈ اس میں آ کر گرنے لگے اور وہ دیوانہ وار ان کو آگ میں گرنے اور ہلاکت سے دوچار ہونے سے روکنے کے لئے بھاگ دوڑ کرنے لگا حتی کہ خالق کائنات نے فرمایا ''لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ'' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ہر مومن کے لئے لازم قرار دیا کہ فرمایا جو برے کام کرنے والوں کے قول و فعل

میں تضاد سے کام لینے والوں کو ہاتھ سے روکتا ہے وہ مومن ہے جو زبان سے روکتا ہے وہ مومن ہے جو دل سے روکتا ہے وہ مومن ہے اور اس کے بعد نہ ایمان کا کوئی درجہ ہے نہ اس سے آگے ایمان کے لئے کوئی گنجائش ہے۔ صراط مستقیم مسلک اعتدال اور راہ اوسط و دوام کو مسلمانوں کی خصوصیت قرار دیا۔

علم حاصل کرنے کو ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے فرض قرار دیا اور تعلیم کے حصول کے مواقع فراہم کئے اس کے لئے نظم بھی کیا اور تدابیر بھی کیں۔ ''بلغوا عنّی ولو آیۃ'' بھی فرمایا۔ ساتھ ہی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات دوسروں سے بیان کرتا پھرے، فرما کر غافلوں کو کوتاہیوں سے بچنے کی ہدایت فرمائی علماء کو ورثۃ الانبیاء قرار دیا اور عالم کی عابد پر فضیلت ایسی بتائی جیسی خود آپ ﷺ کی فضیلت عام مسلمان پر ہے۔ لوگوں کو علم کی دولت سے نوازنے والے پر اللہ، اس کے فرشتے تمام اہل سماوات وارض حتی کہ سوراخوں کے اندر چیونٹیوں کے اور سمندر کے اندر مچھلیوں کے رحمت وسلامتی بھیجنے کی بشارت سنائی۔ فقیہ واحد کو شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری قرار دیا۔ طلب علم کو پچھلے تمام گناہوں کا کفارہ قرار دیا اور کتمان علم کرنے والوں کو قیامت کے دن آگ کی لگام لگائے جانے کی ہولناک خبر سنائی۔ علم سیکھنے کے بعد اسے دوسروں کو سکھانے اور پھیلانے والا صالح اپنے پیچھے چھوڑنے، مصحف کو وراثت میں دینے، مسجد اور مسافروں کے لئے قیام گاہ و پناہ گاہ بنانے، نہر جاری کرنے صحت وتندرستی کی حالت میں اپنے مال سے صدقہ کرنے کو ایسا عمل اور نیکی قرار دیا کہ جو آدمی کو اس کی موت کے بعد اس کا بدل حاصل ہوگا۔

آپ ﷺ نے صرف اصول وضابطے اور احکام وقوانین بیان ہی نہیں کئے، ہر ایک تعلیم کے عملی تقاضے بھی پورے کئے قولی فعلی، بدنی عملی نمونے پیش کئے۔ تحدید نسل، برتھ کنٹرول کے علمبرداروں کو قرآن کریم کی زبان میں وعیدیں سنائیں۔ ''یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت ونادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھہرایا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز راہ راست

پانے والوں میں سے نہیں تھے۔'' (الانعام:۱۴۰)

''آپ کہہ دیجئے کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو (چاہے بعد پیدائش قتل ہو یا سقوط حمل کی شکل میں ہو یا نس بندی وغیرہ تدابیر منع حمل کے ذریعہ ان کو حق پیدائش سے محروم کرنے کی شکل میں ہو) ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے رزق کے اپنے معنی ومفہوم کی عمومیت کے ساتھ اس کی کمی کے اندیشہ سے قتل کرنا یا حق پیدائش سے محروم کرنا جائز نہیں دوسرے اسباب سے قابل غور ہوسکتا ہے) (الانعام:۱۵۱)

''تیرا رب جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے، اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشہ سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل بڑی خطا ہے۔'' (بنی اسرائیل:۳۱)

آپ ﷺ نے اس سوال کے جواب میں کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ فرمایا ''تم اللہ کا شریک ٹھہراؤ، حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہوگی۔'' (متفق علیہ)

حقوق نسواں کے زمرہ میں لڑکیوں کو زندہ رہنے یا پیدا ہونے کے حق سے محروم کرنے والوں کو تنبیہ کی اور وعید سنائی ''جب زندہ گاڑی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا ''بتاؤ تمہیں کس جرم میں قتل کیا گیا؟'' (التکویر:۹،۸) مولانا مودودی کے الفاظ میں ان آیتوں کے انداز میں ایسی شدید غضبناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضبناکی کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ بچی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ کی نگاہ میں ایسے قابل نفرت ہوں گے کہ ان کو مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اس معصوم کو کیوں قتل کیا؟ بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ تو بیچاری آخر کس قصور میں ماری گئی اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے زندہ دفن

کر دیا۔اس کے علاوہ اس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ دیئے گئے ہیں جو الفاظ میں بیان کئے بغیر خود بخود مقصود کلام سے ظاہر ہوتے ہیں۔ایک لوگوں کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جاہلیت نے ان کو اخلاقی پستی کی کس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہی ہاتھوں زندہ درگور کرتے ہیں پھر بھی انہیں اصرار ہے کہ اپنی اسی جاہلیت پر قائم رہیں گے۔دوسرے،اس میں آخرت کے ضروری ہونے کی صریح دلیل پیش کی گئی ہے کہ جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا آخر اس کی کہیں تو دادرسی ہونی چاہئے اور جن ظالموں نے یہ ظلم کیا آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہئے جب ان سے اس بے دردانہ ظلم کی بازپرسی کی جائے۔‘‘
(تفہیم القرآن)

یتیموں اور بے سہارا بچوں اور خواتین کے حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے فرمایا
’’یتیموں کے مال انہیں واپس دو کہ اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ یہ بہت بڑا گناہ ہے اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کرلو (کہ اس طرح ان کے یتیم بچے تمہاری اولاد کے درجہ میں آجائیں گے۔وہ اپنی ماؤں کے لئے غیر اور سوتیلے نہ ہوں گے۔اب تمہارے لئے ان کے ساتھ علیحدگی کا رویہ اختیار کرنے اور امتیازی کا سلوک کرنے کی ضرورت نہ رہے گی) لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ بیویوں کے معاملہ میں عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ فرض جانتے ہوئے ادا کرو۔‘‘ (النساء ۳،۴) (جہیز طلب کرنے یا لینے کا تو مسئلہ ہی نہیں ہے) مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتے داروں نے چھوڑا ہو خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ یہ حصہ اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔(النساء:۷)

فحش کلامی، فحش بیانی، فحش نگاری اور فحش حرکات کی تمام راہیں یہ فرما کر مسدود کی
’’زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو کہ وہ بہت برا فعل ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے (بنی اسرائیل:۳۲)
اور آپ ﷺ نے فرمایا:’’اللہ تعالیٰ نے ابن آدم پر اس کے زنا کا حصہ لکھ دیا ہے جس کا وبال

لامحالہ اس کو پہنچ کر رہے گا۔ دونوں آنکھوں کا زنا اس کی طرف دیکھنا ہے، دونوں کانوں کا زنا اس کے بارے میں سننا ہے اور زبان کا زنا ایسی باتیں بولنا ہے اور ہاتھ کا زنا اس سلسلہ میں پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا اس کی طرف چلنا ہے اور دل خواہش کرتا ہے اور آرزو کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق وتکذیب کرتی ہے۔"

اللہ کے رسول ﷺ نے طہارت وصفائی کو نصف ایمان اور نظافت و پاکیزگی کو ایمان کا اہم حصہ قرار دیا اور اس طرح صفائی و پاکیزگی کی ترغیب دی۔ استنجا تک کے آداب واحکام اور مسائل بیان فرمائے۔ دس چیزیں انسان کی فطرت قرار دیں۔ لبوں (مونچھوں) کا کاٹنا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی دینا، ناخن ترا شنا، جوڑوں کی جگہ کا دھونا، بغلوں کے بال صاف کرنا، زیر ناف بال صاف کرنا۔ پانی سے استنجا کرنا، ختنہ کرنا۔ ایک حدیث میں حیا کرنے، خوشبو لگانے، مسواک کرنے اور نکاح کو رسولوں کی سنت قرار دیا۔ وضوء غسل، پانی تطہیر نجاسات، حقیقی وحکمی خفیفہ وغلیظہ کے احکام ومسائل بیان فرمائے۔ نماز، روزہ، حج وزکوۃ کی باریک اور موٹی باتوں کو بتایا بھی اور کر کے دکھایا بھی۔ دانش و حکمت کی باتوں کی تعلیم دی، نمازیوں کی امامت بھی فرماتے اور فوجوں کی قیادت بھی۔ مملکت اسلامیہ کا نظم ونسق اس طرح کیا کہ ہر حرکت وعمل سے اپنے بعد والوں کے لئے راہنما خطوط پیش کر دیئے۔ قربانیاں بھی دیں اور سجدہ شکر بھی ادا کئے، جنازہ کی نماز بھی پڑھائی، جنازہ کے ساتھ بھی چلے اور کفن دفن میں بھی شریک رہے۔ روئے بھی، گڑگڑائے بھی مسکرائے بھی اور مزاح بھی کیا۔ خوشی اور غم سب کے آداب بیان فرمائے۔ اپنے ہر عمل سے چھوٹوں بڑوں کو درس دیا۔

دنیا کی سیر بھی کی اور اللہ کی نعمتوں سے فیضیاب بھی ہوئے۔ دوست واحباب بھی بنائے اہل وعیال کے ساتھ بھی سبق آموز برتاؤ کیا۔ بشارت اور خوشخبریاں بھی دیں اور وعیدیں بھی سنائیں، کسب رزق کی ترغیب بھی دی۔ حلال رزق کے حصول کو فرض قرار دیا۔ حرام سے بچنے کی تلقین کی۔ معاملات بھی کئے اور معاملات کے آداب بھی بتائے۔ قرض لینے اور اس کو چکانے کھیتی باڑی، اجارہ واستخارہ کے بارے میں تفصیل سے احکام ومسائل

بیان فرمائے۔ نکاح بھی کئے، نکاح کی ترغیب بھی دی اور نکاح کو اپنی خاص سنت قرار دیتے ہوئے اس سے اعراض کرنے والوں کو ''لیس منا'' کی وعیدیں بھی سنائیں۔ ازدواجی زندگی گزارنے کے مثالی عملی نمونے بھی پیش کئے۔ حسن معاشرت اور حسن کردار کا شاندار مرقع پیش کیا۔ ازدواجی زندگی میں پیش آنے والی اونچ نیچ سے نمٹنے کی تدابیر بھی بیان فرمائیں۔ دوست واحباب، اجنبی شناسا، مہمان ومسافر، لونڈی غلاموں، ملازمین، آقا، والدین اور اولاد، رشتہ داروں اعزا واقرباء اور پڑوسیوں کے باہمی حقوق وفرائض کا تعین فرمایا۔ ننھے بچوں کو پالا گود میں کھلایا، ان کو پیار کیا۔ ان کی پرورش کی، ادب وتہذیب سکھائی عائلی قوانین بھی مقرر فرمائے۔ تعزیری احکام صادر فرمائے، شفاعت وسفارش کی حدود بھی مقرر کیں۔

اللہ رب العزت خالق و مالک سے بھی تعلق ہے۔ دوست واحباب بھی ہیں۔ بیوی بچوں کے معاملات بھی ہیں۔ دشمنوں سے بھی سابقہ ہے۔ سرداروں سے ملاقاتیں ہیں بچوں اور غلاموں کے دکھ درد میں بھی شریک ہیں زندگی کا ہر لمہ مصروفیت اور سرگرمی کا ہے۔ ہر قدم پر اپنوں اور پرایوں کی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ ہر پل اور ہر لحہ کا ریکارڈ رکھا جا رہا ہے اور یہ ریکارڈ آج تک محفوظ چلا آ رہا ہے جو ہر متلاشی حق کے لئے کھلی کتاب ہے۔ درس عبرت ہے، موعظمت ونصیحت ہے، آدرش ونمونہ ہے۔ وہ دن اور آج کا دن ہر دور میں آپ ﷺ کے پیروکار بھی ہیں اور غیر جانبدار حق کے متلاشی بھی رہے ہیں۔ دشمنوں اور بدخواہوں کی چیرہ دستیاں بھی رہی ہیں لیکن یہ آفتاب و ماہتاب ہمیشہ چمکتا دمکتا رہا ہے، نور سے منور رہا ہے، حکمت ودانش کے جواہر لٹاتا رہا ہے، راہ حق کی طرف رہنمائی وہدایت کا فریضہ انجام دیتا رہا ہے اور دیتا رہے گا۔

سیرت کا مطلوبہ نوجوان

زمانے میں جب بھی کوئی انقلاب آیا، نوجوانوں کے دم قدم سے ہی آیا ہے۔ آج بھی صالح معاشرہ کی تعمیر کے لئے صالح انقلاب عزم جواں اور بلند حوصلہ نوجوانوں کے ذریعہ ہی آئے گا۔ لیکن دور حاضر ایسے بے داغ شباب کے مالک جوانوں کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے جس معاشرہ میں آنکھ کھولی، وہ بگاڑ کے انتہائی درجہ کو پہنچ چکا تھا۔ اسی ماحول میں آپ ﷺ نے اپنا لڑکپن اور جوانی کے ایام گزارے۔ مکہ کے لوگوں نے آپ ﷺ کے کردار کا لوہا مان لیا۔ امین وصادق کے خطابات سے آپ ﷺ کو نوازا، لیکن جیسے ہی آپ ﷺ کو نبوت کی ذمہ داری پر فائز کیا گیا۔ آپ ﷺ کو چاہنے والے آپ کے مخالف ہو گئے، جانی دشمن بن گئے۔ حق اور باطل کی کشمکش شروع ہوئی اور آخر حق غالب آیا۔ آپ ﷺ نے ایک قلیل مدت میں نوجوان صحابہ کی ایک مختصر جمعیت کے ذریعہ اور رب کائنات کی مدد سے زمین پر ایک صالح انقلاب برپا کر دیا اور آپ ﷺ کے یہ ساتھی زمانے میں حق وصداقت کا پیکر اور عدل وانصاف کے علمبردار بن کر اُبھرے۔

آج پھر اُسی رحمت عالم کے اُسوہ کی روشنی میں نوجوانوں کی تیاری مقصود ومطلوب ہے تاکہ محروم انسانیت، جوہر انسانیت سے آشنا ہو جائے اور زمانہ امن وشانتی کا گہوارہ بن جائے۔

آپ ﷺ کے تیار کردہ دین حق کے سپاہی، بہادر وشجاع ضرور تھے لیکن دنیا کے حریص نہ تھے۔ کیونکہ انہیں ایک مقصد عظیم کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے تو رحمت عالم ﷺ نے انہیں وصیت کی۔ ''اے علی

تم انہیں جنگ سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کرو۔ تمہارے ذریعہ کسی ایک انسان کو ہدایت مل جائے یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ تمہیں مال غنیمت میں سے سرخ اونٹ مل جائیں، جو نایاب اور بے بہا ہوتے ہیں''۔ اس دور کا اصل سرمایہ یہ سرخ اونٹ ہی تھے۔ لیکن تربیت یہ دی جارہی ہے کہ مال غنیمت نہیں بلکہ اللہ کے بندوں کو صراط مستقیم کی طرف بلانا۔ یہ اصل سرمایہ ہے۔ وہ دوزخ کی آگ سے بچ جائیں، آخرت میں سرخرو ہوں۔ اس میں ہے تمہاری اصل کامیابی۔ موازنہ کیجئے۔ دنیا کو قبضہ میں کرنے والے، دنیا کی مال ومتاع سمیٹنے پر لبیک کہنے والوں کی عظیم اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ سابقون الاولون میں سب ہی لوگ چالیس سال سے کم تھے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کے سینوں میں سب سے پہلے توحید خالص کے عقیدے کو راسخ کیا۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو نصیحت کی: ''اے لڑکے تو اللہ تعالیٰ کا خیال رکھ (یعنی اس کے احکام کی تعمیل اور اس کے حقوق کی ادائیگی سے غافل نہ ہو) اللہ تعالیٰ تیرا خیال فرمائے گا اور دنیا وآخرت کی بلاؤں سے تیری حفاظت کرے گا۔ تو اللہ کو یاد رکھ جیسا کہ یاد رکھنا چاہئے۔ اس کو تو اپنے سامنے پائے گا اور جب تو کسی چیز کو مانگنا چاہے تو بس اللہ سے مانگ اور جب کسی ضرورت اور مہم میں مدد کا محتاج اور طالب ہو تو اللہ ہی سے امداد واعانت طلب کر اور اس بات کو دل میں بٹھا لے کہ اگر ساری انسانی برادری بھی باہم متفق ہو کر اور مل کر چاہے کہ تجھ کو کسی چیز سے نفع پہنچائے تو صرف اس چیز سے تجھ کو نفع پہنچا سکے گی جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے مقدر کر دی ہے۔ اس کے سوا کسی چیز سے نہیں۔ اور اسی طرح اگر ساری انسانی دنیا تجھ کو کسی چیز سے نقصان پہنچانا چاہے تو صرف اس چیز سے نقصان پہنچا سکے گی جس سے نقصان پہنچنا اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے تیرے لئے مقدر کر دیا ہے۔ اس کے سوا کسی چیز سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اٹھ چکے قلم اور خشک ہو چکے صحیفے۔''

اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں سیرت کے مطلوبہ نوجوان کا اندازہ لگائیے کہ اگر اس طرح توحید کے تقاضوں کو سمجھ کر وہ زندگی گزارے تو ہر آنے والی آزمائش یا مصیبت کا

وہ نہایت دلیری سے مقابلہ کرسکتا ہے۔ صحابۂ کرام کی زندگی اس کا عملی نمونہ ہے۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ نفع ونقصان سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ آج گوناگوں خطرات اور اندیشوں کا شکار ہمارے نوجوان خوف وہراس کے مبہم سایوں میں زندگی بسر کررہے ہیں۔ حالانکہ اللہ کا وعدہ ہے: ''جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور پھر وہ اس پر قائم رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔''

سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں نوجوانوں کی زندگی کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''جس نے لوگوں کو ناراض کر کے اللہ کی رضا جوئی حاصل کی، اللہ تعالیٰ اُسے لوگوں کی تکالیف سے محفوظ رکھے گا اور جس نے اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کو خوش کرنا چاہا، اسے اللہ تعالیٰ لوگوں کے سپرد کردے گا۔'' یہ توحید خالص، روحانی اور باطنی پاکیزگی کا ضامن ہے۔ آپ ﷺ نے ظاہر و باطن کی پاکیزگی اور روح کے ساتھ جسم کی طہارت کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے۔ ایک صالح نوجوان کو اپنی عظیم ذمہ داریوں کے ساتھ اپنے نفس اور اپنی ذات سے بھی بے توجہی نہیں برتنی چاہئے۔ جسم اور روح کے درمیان ایک گہرا توازن برقرار رکھنا چاہئے۔ یہ انتہائی درجہ لغو خیال ہے کہ سادگی کے نام پر اپنے حلیہ کو کوئی عجوبہ بنالیا جائے کہ جس سے مومن کی ظاہری ہیئت مضحکہ خیز بن کر رہ جائے۔ سیرت کے مطلوبہ نوجوان میں ظاہری اور باطنی پاکیزگی کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور ایک طاقتور مومن کو کمزور مومن پر فوقیت دی گئی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے کھانے پینے کے تعلق سے بھی بہترین رہنمائی فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی نے شر کے لحاظ سے اپنے پیٹ سے بُرا برتن اور کوئی نہ بھرا۔ اگر اُسے کھانا ہی ہے تو پیٹ کا تہائی کھانے کے لئے، تہائی پینے کے لئے اور تہائی سانس کے لئے رکھے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کھانے پینے میں زیادتی سے بچو، کیونکہ بسیار خوری سے جسم میں خرابی آتی ہے۔ بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور نماز میں تساہل اور سستی پیدا ہوتی ہے۔ کھانے پینے میں میانہ روی سے کام لو کیونکہ اس سے جسم درست رہتا ہے۔ بیماری نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ پیٹو اور موٹے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ آدمی اس وقت تک ہرگز

ہلاک نہیں ہوتا جب تک کہ اپنی شہوت کو اپنے دین پر ترجیح نہ دے۔''

اب اگر سیرت کے اس پیغام کی روشنی میں نوجوان اپنے کردار کی تعمیر کریں۔ تو ان کے لئے حفظانِ صحت کے یہ اصول کس قدر مفید ہیں؟ لیکن افسوس کہ آج نوجوان نہ کھانے پینے میں توازن کا خیال رکھتے ہیں نہ ہی وہ مضرِ صحت چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ جب کہ حال یہ ہے کہ اپنی خرابی صحت کے سبب نہ عبادت کا حق ادا کر سکتے ہیں، نہ اپنے حقوق و فرائض کی ادائیگی کر سکتے ہیں۔ ایک عالم نوجوان تو نشہ آور اور نیند لانے والی دواؤں سے بھی پرہیز کرتا ہے، حرام چیزوں کے استعمال کا تو سوال ہی نہیں۔ وہ دواؤں کا استعمال صرف مرض کی حالت میں کرتا ہے ورنہ صحت کی حالت میں اس کے جسمانی نظام کو ہر چیز فطری صحت اور نشاط پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ صحت مند نوجوان اپنے والدین اور رشتہ داروں کے بھی حقوق ادا کر سکتا ہے ورنہ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ ایک مریض نوجوان، بے احتیاطی کے ساتھ زندگی گزارنے والا، چلتی پھرتی لاش کی مانند، نہ عبادات کا حق ادا کرے اور نہ ہی والدین کی خدمات بجالائے۔ جب کہ حقیقی مسلمان کی نمایاں صفت بتائی گئی ہے کہ وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ قرآن مجید میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔ فرمایا وقت پر نماز ادا کرنا۔ میں نے کہا پھر کونسا، فرمایا: والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ میں نے کہا پھر کون سا۔ فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔''

مربی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو دو عظیم اعمال کے درمیان رکھا ہے۔ وقت پر نماز پڑھنا اور خدا کی راہ میں جہاد کرنا، نماز دین کا ستون ہے اور جہاد اسلام کا سب سے بلند حصہ۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ رسول عربی ﷺ نے نماز کے بعد اور جہاد سے پہلے والدین کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ ساتھ حسن سلوک کا ذکر کر کے والدین کو کتنا عظیم مرتبہ عطا فرمایا۔ والدین اگر چہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں ان کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

جب حضرت سعد بن ابی وقاص کی والدہ نے ان کے اسلام لانے پر ناراضگی کا اظہار کیا اور ان سے کہا کہ تم اسلام سے پھر جاؤ ورنہ میں کھانا پینا چھوڑ دوں گی اور مر جاؤں گی۔ تمہارے لئے شرمندگی کا باعث ہوگا اور لوگ کہیں گے کہ اس نے اپنی ماں کو مار ڈالا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: جان لو خدا کی قسم اگر تمہاری سو جانیں ہوں اور ایک ایک کر کے سب نکل جائیں تب بھی میں اسلام سے نہیں پھروں گا۔ ان کی ماں نے ایک دن صبر کیا۔ دو دن صبر کیا۔ تیسرے دن جب زیادہ بھوک نے ستایا تو کھانا کھالیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کی نافرمانی کو گناہ کبیرہ میں شمار کیا ہے۔ حضرت ابوبکرہ نفیع بن الحارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا ''کیا میں تم کو بڑے گناہوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا کیوں نہیں اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک کرنا اور والدین کی نافرمانی۔''

پھر آپ ﷺ نے والدین کے مرتبہ کو اس قدر بلند فرمایا کہ ان کے بعد ان کے رشتہ داروں کا حق رکھا۔ ایک شخص نے آپ ﷺ سے سوال کیا۔ ''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا کچھ نیکی باقی ہے کہ میں اپنے والدین کے مرنے کے بعد کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں ان کے مرنے کے بعد چار چیزیں کرنے کی ہیں۔ ان کے لئے دعا و استغفار کرنا، ان کے عہد کو پورا کرنا، ان کے دوستوں کی عزت کرنا اور ان کے رشتوں کو جوڑنا، جو ان کے بغیر نہیں جوڑے جاسکتے۔''

یہ ہیں بلند انسانی جذبات کہ اولاد اپنے والدین کے مرنے کے بعد بھی ان کا عہد پورا کرے اور ان کے دوستوں، رشتہ داروں کی عزت کرے، اُن کا حق ادا کرے۔

سیرت کے پیغام میں نہایت درجہ حسن معاشرت کی تعلیم بھی نمایاں ہے۔ مسلمان نوجوان جب شوہر کے درجہ کو پہنچے تو آپ ﷺ نے انہیں بھی متنبہ کیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پہلوؤں میں سب سے زیادہ ٹیڑھا حصہ اوپر کا ہے۔ اگر اس کو سیدھا کرو گے تو ٹوٹ جائے گی اور اگر چھوڑے رہو گے تو ٹیڑھی ہی رہے گی۔ پس عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔''

آج نوجوانوں میں سیرت رسولؐ سے وابستگی نہ ہونے کے سبب معاشرے کا کیا حال ہے؟ عورت کس مقام کو پہنچ گئی ہے اور ان تعلیمات پر عمل نہ ہونے کے نتیجہ میں دین کس قدر رسوا ہو رہا ہے۔ اگر اس حدیث مبارکہ کو سامنے رکھ کر ہم اس پر عمل پیرا ہوں تو معاشرے کی تصویر ہی کچھ اور ہو کہ ہم اسلامی معاشرہ کو انسانی معاشرہ کے سامنے بطور نمونہ پیش کر سکیں۔

انسانی جذبات کا خیال سیرت مبارکہ میں کس قدر رکھا گیا ہے کہ عبادت جیسے اشرف عظیم عمل میں غلو برداشت نہیں کیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی عبادت میں غلو کرنے کے بارے میں معلوم ہوا تو ان سے فرمایا: ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم دن میں مسلسل روزے رکھتے ہو اور رات میں مسلسل نمازیں پڑھتے ہو۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟ عرض کیا۔ کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا نہ کروں۔ کبھی روزہ رکھو۔ کبھی روز نہ رکھو۔ کچھ وقت سویا کرو اور کچھ وقت نماز پڑھو۔ کیونکہ تم پر تمہارے بدن کا بھی حق ہے۔ تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ تمہاری بیوی کا بھی حق ہے اور تمہارے مہمانوں کا بھی حق ہے۔''

کس قدر دین فطرت ہے اسلام۔ میانہ روی کو پسند کیا گیا ہے اور غلو یا افراط و تفریط سے اجتناب برتا گیا ہے۔ لیکن ہمارے نوجوان اور عام مسلمان جب دینداری کی چادر اوڑھ لیتے ہیں تو اس قدر غلو کہ پھر نہ اپنے آرام کی پروا اور نہ بال بچوں کا خیال، نہ بیوی کے حقوق کا احساس صورت حال تو یہ بھی ہے کہ گھر کی چار دیواری میں بیوی کے لئے نہایت خشک مزاج، جب کہ سیرت رسولؐ ہمارے سامنے کس قدر نیچرل اور حسن معاشرت کا نمونہ پیش کرتی ہے کہ آپ ﷺ اپنی ازواج کے ساتھ نرم خوئی۔ کشادہ روئی، خوش طبعی اور جنسی مذاق کا ایک بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حریرہ (دودھ گھی اور آٹے سے تیار کیا ہوا کھانا) لے کر آئی جسے میں نے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تیار کیا تھا۔ وہاں

سودہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے اور ان کے بیچ میں تھے۔ میں نے سودہ رضی اللہ عنہا سے کہا: کھاؤ۔ انہوں نے انکار کیا۔ میں نے کہا کھاؤ ورنہ تمہارے چہرے پر لیس دوں گی۔ انہوں نے پھر بھی انکار کیا۔ میں نے "حریرہ" میں اپنا ہاتھ ڈالا اور ان کے چہرہ پر لیس دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہنسنے لگے۔ آپ ﷺ نے سودہؓ سے فرمایا تم بھی اس کے چہرے پر لیس دو۔ چنانچہ انہوں نے بھی پلیٹ سے کچھ لے کر میرے چہرے پر لیس دیا اور آپ ﷺ ہنستے رہے۔"

گھر کے ماحول میں اس طرح کی خوش طبعی دل لگی اور ہنسی مذاق کیا آج کے دیندار گھرانوں میں موجود ہے؟ آج صورت حال یہ ہے کہ نوجوان اپنے حال میں مست، نہ گھر میں خوشگوار ماحول، نہ رشتہ داروں سے روابط بلکہ اس قدر نازک مزاج کہ معمولی معمولی باتوں پر رشتہ داروں سے قطع تعلق کر بیٹھتے ہیں۔ جب کہ قطع رحمی ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ سیرت کے آئینہ میں دیکھئے:

آپ ﷺ نے فرمایا: "قطع رحمت اور بغاوت سے بڑھ کر کوئی گناہ ایسا نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے ارتکاب کرنے والے کو اللہ تعالیٰ آخرت میں سزا دینے کے ساتھ دنیا میں بھی سزا دے گا۔"

اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا؟ اور سرکارِ دو عالم ﷺ نے اپنی بعثت کا مقصد بیان فرمایا کہ "میری بعثت کا مقصد یہ ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تعمیل کروں۔"

سیرت کے البم سے اگر ہم مثالی کردار کی تصاویر دیکھنا چاہیں تو حیات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ملے گا جس میں آپ ﷺ نے ہماری بہترین رہنمائی نہ فرمائی ہو۔ حقوق انسانی کا لحاظ رکھنے کی جو تلقین آپ ﷺ نے فرمائی وہ بے مثال ہے۔ پھر ان رذائل سے بچنے کی بھی تلقین کی ہے جو اخلاقی پستی کا سبب بنیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "چار خصلتیں جس کے اندر پائی جائیں وہ خالص منافق ہے اور جس کے اندر کوئی ایک خصلت پائی جائے اس میں نفاق کی ایک علامت ہوگی۔ جب تک کہ وہ اُسے ترک نہ کردے۔

(۱) اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

(۲) گفتگو کرے تو جھوٹ بولے۔

(۳) کوئی وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے۔

(۴) اور جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اُتر آئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے اخلاق رکھنے والے شخص کو اللہ کا سب سے زیادہ محبوب بندہ قرار دیا ہے۔ حضرت اسامہ بن شریک کی روایت کردہ حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں: ''ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خاموش بیٹھے تھے۔ گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں کہ کچھ لوگ آئے اور عرض کیا۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب بندہ کون ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا ''جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔''

آپ ﷺ نے مسلم نوجوانوں کو عدل وانصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے کو نصیحت کی اور ظلم وزیادتی کرنے سے سختی سے روکا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا ''ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم کا نتیجہ قیامت میں گھٹاٹوپ تاریکیاں ہیں۔'' ایک حدیث قدسی کے ذریعہ ظلم کو قطعی حرام قرار دیا گیا ہے: ''اے میرے بندو! میں نے اپنے آپ پر ظلم کو حرام کر لیا ہے اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے۔ اس لئے باہم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ سیرت کا مطلوبہ نوجوان اخلاق کے بلند مرتبہ پر فائز ہوتا ہے اور ظلم وزیادتی سے اجتناب کرتا ہے۔

بعثت نبوی کا مقصد

لوگ خیال کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے مذہبی پیشوا ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں کوئی پاپ نہیں کیا اور مذہب اسلام کی تبلیغ واشاعت میں اپنی ساری زندگی صرف کردی۔ عام مسلمان بھی اس خیال میں مبتلا ہیں کہ نبی کریم آخری رسول و نبی ہیں جنہوں نے نماز روزہ حج وزکوۃ کا حکم دیا اور اسلام کی تبلیغ کے لئے جہاد کیا۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جو یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ بعثت نبویؐ کا آخر کیا مقصد تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبیؐ بنانے کا مقصد کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس مشن اور پیغام کو لے کر آئے تھے؟ ۲۳ر سالہ دور نبوت میں آپ ﷺ نے کیا کارنامہ انجام دیا وغیرہ۔ ہر سال ۱۲ر ربیع الاول آتا ہے اور ساری دنیا میں میلاد النبی منایا جاتا ہے، آپ ﷺ کو یاد کیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت کی محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں آپ ﷺ کے حسن اخلاق کے چرچے ہوتے ہیں، مسلم دنیا میں عام تعطیل کے ساتھ جشن ولادت باسعادت کا اہتمام ہوتا ہے۔ جلسے جلوس میلاد کی محفلیں، نعت گوئی کے مقابلے، زرق برق لباس اور مٹھائی وحلوے کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ آپ ﷺ سے محبت، عقیدت اور تعلق خاطر کا ہر مسلمان اپنے اپنے انداز سے اظہار کرتا ہے۔ لیکن افسوس کہ کروڑوں مسلمانوں میں سے چند کو بھی اس بات کی توفیق وفکر نہیں ہوتی کہ یہ بات معلوم کریں کہ آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں کیوں تشریف لائے تھے اور آپ ﷺ نے کیا عظیم کارنامہ انجام دیا کہ ساری دنیا میں آپ کی ہر سال یاد منائی جاتی ہے؟ سانحہ تو یہ ہے کہ مسلم امت بھی بعثت کے مقصد اور پیغام نبوت سے دور ہونے لگی ہے۔ جس کا نتیجہ ہے کہ غیر لوگ سیرت پر انگلیاں اٹھانے لگے ہیں۔

دنیا میں یوں تو کئی ہستیاں گزری ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنی بساط کے مطابق انسانوں کی بھلائی کے لئے کچھ کارنامے انجام دیئے ہیں۔ چنانچہ خدمت خلق، انسانی بھلائی مساوات، بھائی چارہ عدم تشدد اور انصاف کو لے کر انہوں نے جدوجہد کی اور لوگ ان کی سعی و کوشش کو گاہے بگاہے یاد بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان سب کا معاملہ یہ تھا کہ انہوں نے زندگی کے کسی ایک مسئلہ کو لے کر اس کے حل کے لئے اپنی زندگی لگادی اور دیگر انسانی مسائل اور معاملات سے انجان رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی افراط و تفریط کا شکار ہوگئی اور وہ سماج و معاشرہ کو کوئی ٹھوس نظریہ یا اصول نہیں دے پاسکے اور اکثر انسانوں کے کئی ایک امور و مسائل میں وہ بہروپیہ پن کا شکار ہو گئے اور کبھی وہ اپنی انفرادی زندگی کے تقاضوں کو فراموش کر بیٹھے اور کہیں اجتماعی امور و معاملات سے راہ فرار اختیار کی جس کی وجہ سے وہ انسانیت کی کوئی جامع اور ٹھوس خدمت نہیں کر سکے۔ ان کی زندگیاں تاریخ کا حصہ تو بن گئیں لیکن وہ اپنا کوئی اثر عوام میں نہ چھوڑ سکے۔ برخلاف اس کے ہر زمانہ اور ہر علاقہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلسل اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا تا کہ وہ انسانوں کو زندگی گزارنے کا سلیقہ و طریقہ بتلاسکیں تا کہ انسان اپنے خالق و مالک کو بھی پہچان سکے اور اپنی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کو بھی بحسن و خوبی ادا کر سکے۔

قرآن مجید میں خالق کائنات نے رسول کی بعثت کے مقصد کو واضح انداز میں پیش فرمایا ہے:

''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایت کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔'' (الحدید)

بعثت نبویؐ کے مبارک مقصد کو ایک مرتبہ مکہ کے سرداروں کے سامنے نبی کریم ﷺ نے یوں بیان فرمایا ''میں جو دعوت تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں اس کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے کہ میں مال جمع کرنا چاہتا ہوں بلکہ اللہ نے تمہارے پاس مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ کو اپنی کتاب سے نوازا ہے اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو تمہارے غلط نظام زندگی کے عواقب اور نتائج سے آگاہ کروں اور اس دعوت کو قبول کرنے کے نتیجہ میں جو کچھ ملنے والا

ہے اس کی خوشخبری دوں۔ تو میں نے تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا ہے اور تمہاری خیر خواہی پہلے بھی پیش نظر تھی اور آج بھی ہے۔ اگر تم لوگ میری اس دعوت کو اپنا لو تو دنیا و آخرت میں تمہاری خوش نصیبی ہوگی۔ اللہ کے رسول ﷺ کے مندرجہ بالا الفاظ کو غور سے پڑھئے واضح انداز میں آپ ﷺ نے اعلان فرد یا کہ:

(۱) اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اپنی کتاب سے مجھے نوازا ہے۔

(۲) میری دعوت کا مقصد نہ مال جمع کرنا ہے اور نہ حکومت واقتدار حاصل کرنا ہے۔

(۳) اللہ نے مجھے غلط نظام زندگی سے خبردار کرنے کا حکم دیا ہے۔

(۴) اس دعوت کے نتیجہ میں جو چیز ملنے والی ہے اس کی خوشخبری دے دوں۔

(۵) میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔

(۶) میں دعوت کا کام محض تمہاری خیر خواہی کے لئے کر رہا ہوں۔

(۷) میری دعوت کو تم قبول کرلو تو یہ دونوں جہاں کی خوش نصیبی ہوگی۔

یہ پیغام تھا جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں پیش کیا۔ آپ ﷺ نے پیغام سنا کر خاموشی نہیں اختیار کی بلکہ آپ ﷺ نے اپنے کردار اور عمل کی قوت سے اور مسلسل و بے نکاتی کوشش وسعی کے ذریعہ ایک پاکیزہ اور صالح معاشرہ تشکیل دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا غیر جانبداری سے مطالعہ کرنے پر ہر شخص محسوس کرے گا کہ کارِ رسالت کا حق آپ ﷺ نے بحسن وخوبی مکمل طور پر ادا کیا۔ انسانوں کے قلوب سے دنیا کی محبت کم کی اور آخرت کا شوق اور طلب پیدا کی۔ دوزخ سے بچنے اور جنت کے حصول کی کوشش کرنے کا داعیہ پیدا کیا۔ آپ ﷺ کی تربیت کا اتنا اثر ہوا کہ جہالت و پسماندگی سے نکل آنے والے افراد نے عظیم الشان کردار و عمل پیش کیا۔ اللہ کی خوشنودی اور رضا کو انہوں نے اپنی زندگی کا مطمح نظر بنالیا اور آخرت کی طلب اور اللہ کی رضا کی خاطر کسی چیز کو بھی خاطر میں آنے نہیں دیا۔ چنانچہ خلیفہ وقت پیشگی تنخواہ کی درخواست کرتا ہے تو بیت المال کا نگراں، جو امانت و دیانت کا اتنا مضبوط پیکر تھا کہ خلیفہ کی درخواست کو نامنظور کر دیتا ہے۔ رات کی تاریکی میں ایک ماں اپنی لڑکی کو دودھ میں پانی ملانے کا حکم دیتی ہے لیکن اللہ کے سمیع وبصیر

ہونے کا لڑکی کو اتنا یقین تھا کہ وہ ماں کی درخواست کو ٹھکرا دیتی ہے۔

جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے خوبصورت لڑکی کے ساتھ بستر پر جا کر بھی ایک نوجوان خوف خدا سے کانپ جاتا ہے اور پاکدامنی اختیار کر لیتا ہے۔ ایک خاتون اپنے گناہ کی سزا کے لئے دربار نبویؐ کے بار بار چکر لگاتی ہے۔ خلیفہ وقت رعایا کی ضرورت کی تکمیل کے لئے نیند قربان کر کے اور بوجھ اٹھا کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ آج کا معاشرہ غور کریں تو اسی کیفیت کا شکار ہے جس میں مکہ کا معاشرہ قبل از نبوت مبتلا تھا۔ اصول وضوابط اور نظریات اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ امن و انصاف عدل وقسط قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ بدامنی ظلم وفساد تفاخر و تفاوت عام ہو چکا ہے۔ اخلاقی و معاشرتی بگاڑ ذہن و دماغ پر سرایت کر چکا ہے۔ معیشت پر سود اور کرپشن کا قبضہ ہو چکا ہے سیاست خودغرض اور مفاد پرست افراد کے ہاتھ میں ہے لیکن آج بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ موجود ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات اور ہدایات کم و کاست موجود ہیں اور آپ ﷺ نے جو نظام زندگی دنیا کے سامنے پیش کیا وہ بھی موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا، نبیؐ کے امتی اُٹھ کھڑے ہوں۔ عزم و توکل پیدا کریں اور اخلاص و عمل کی مدد سے نبی رحمت ﷺ کی تعلیمات کو انسانوں کے سامنے پیش کریں اور بتلائیں کہ نبی رحمت ﷺ صرف مسلمانوں کے نبیؐ نہیں بلکہ رحمتہ للعالمین ہیں اور آپ ﷺ کی تعلیمات بلاتفریق عرب وعجم، فرقہ یا گروہ، زبان و مکان سارے انسانوں کے لئے فلاح اور نجات کا ذریعہ ہے اور اتباع رسول ﷺ ہی میں سارے انسانوں کی دنیوی فلاح اور آخرت کی کامیابی مضمر ہے۔ یہ وہ پیغام ہے جس کے علمبردار مسلمان ہیں اور ہر سال میلاد النبیؐ کا دن یہی یاد دلاتا ہے اور میلاد کا جشن اور بعثت نبویؐ پر خوشی و مسرت کے اظہار کا حق ان ہی لوگوں کو حاصل ہے جن کی زندگیاں اسوۂ حسنہ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں اور جو دعوت اسلامی کو عام کرنے اور پھیلانے کے عزم و حوصلہ سے سرشار ہیں اور جنہوں نے دین کی اقامت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے کاش ملت اسلامی اس نکتہ کو سمجھ پاتی۔ وما علینا الا البلاغ

امانت کی حقیقت قرآن وحدیث کی روشنی میں

اسلام ایک کامل ومکمل دین اور دائمی ضابطہ حیات ہے، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور اسوہ حسنہ رشد وہدایت کا سر چشمہ، مینارہ نور اور منبع ہدایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں انسانیت کے تمام مسائل کا حل موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ہر دور کے مسائل کا حل اور ہر عہد کے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کا جامع دستور موجود ہے، یہ دین ودنیا کے تمام مسائل میں انسانیت کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں عبادات، معاملات، اخلاقیات، معاشرت، تہذیب وتمدن، دین ودنیا کے مسائل میں انسانیت کی رہبری فرمائی، جہاں بنی نوع آدم کو جامع دستور حیات اور ابدی ضابطہ زندگی بھی عطا فرمایا، وہیں دینی معاملات میں رہنمائی فرمائی۔

امانت کا لغوی مفہوم

لفظ امانت ''امن سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے مطمئن اور مامون کرنا، امانت کو امانت اس لیے کہا جاتا ہے کہ امانت والا شخص ایذا رسانی حق تلفی وکوتاہی اور حقوق کی ادائیگی اور شی مامون کے ضائع ہونے سے متعلق امانت رکھنے والے کو مطمئن و مامون کر دیتا ہے، اس وجہ سے امانت کو امانت کہا جاتا ہے۔ صاحب لسان العرب ابن منظور فرماتے ہیں: لفظ امانت کا استعمال اطاعت وعبادت (تکالیف شرعیہ)، اعتماد واعتبار اور حفاظت کے معنی ہوتا ہے اور احادیث میں لفظ امانت کو مذکورہ معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ (لسان العرب ۱۳/۲۲)

اِنَّ اللّٰـهَ يَـا مُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا ط وَاِذَا حَكَمْتُمْ
بَيْنَ النَّاسِ ط اَنْ تَـحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ط اِنَّ

اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْراً۔ (النساء:۵۸]

(بے شک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں، تو فیصلہ کرو انصاف سے، اللہ اچھی نصیحت کرتا ہے تم کو بے شک اللہ ہے سننے والا دیکھنے والا۔)

مفتی محمد شفیع عثمانی آیت کی تفسیر کے اختتام میں بطور خلاصہ تحریر ماتے ہیں: اس جگہ یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن حکیم نے لفظ امانت بصیغہ جمع استعمال فرمایا جس میں اشارہ ہے کہ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی کا کوئی مال کسی کے پاس رکھا ہو جس کو عام طور پر امانت کہا اور سمجھا جاتا ہے؛ بلکہ امانت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں جو واقعہ آیت کے نزول کا ابھی ذکر کیا گیا خود اس میں بھی کوئی مالی امانت نہیں، بیت اللہ کی کنجی کوئی خاص مال نہ تھا؛ بلکہ یہ کنجی خدمت بیت اللہ کے ایک عہدہ کی نشانی تھی۔ (معارف القرآن ۲/۴۴۶)

امانت کی قسمیں

امانت کی بے شمار قسمیں ہیں، اسی لئے لفظ امانت کو مصدر ہونے کے باوجود (قرآن پاک میں کئی مقامات پر) جمع کے صیغہ کے ساتھ لایا گیا ہے تا کہ امانت کی سب قسموں کو شامل ہو جائے خواہ وہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے، حقوق اللہ سے متعلق امانات تمام شرعی فرائض وواجبات کا ادا کرنا اور تمام محربات ومکروہات سے پرہیز کرتا ہے۔ حقوق العباد سے متعلق امانات میں مالی امانت کا داخل ہونا، تو معروف ومشہور ہے کہ کسی شخص نے کسی کے پاس اپنا کوئی مال امانت کے طور پر رکھ دیا یہ اس کی امانت ہے، اس کی حفاظت اس کے واپس کرنے تک اس کی ذمہ داری ہے۔ (معارف القرآن ۶/۲۹۸]

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الْاِنْسَانُ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا – (الاحزاب :۷۲)

(ہم نے آسمان، زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی، انہوں نے

اس امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس امانت (کے بوجھ) سے ڈر گئے، انسان نے اس امانت کو اٹھالیا، یہ انسان بڑا ظالم و جاہل ہے۔ امانت پیش کرنے سے مراد دین کے احکام کو پیش کرنا ہے، (تفسیر قرطبی ۱۴/۲۵۳) یعنی اللہ تعالی نے زمین و آسمان اور پہاڑوں پر دین کے احکام پیش کئے، ان سے کہا کہ اگر تم اس امانت کو اٹھا لو، تو اللہ کی فرمانبرداری کرنے کی صورت میں تم کو بہترین اجر دیا جائے گا اور نافرمانی کرنے کی صورت میں زبردست سزا دی جائے گی۔)

اس امانت میں اللہ کی توحید اور اس کی عبادت یقینی طور پر شامل رہی ہوگی، رہ گئے دوسرے احکام، تو وہ ہر مخلوق کو اس کی ساخت اور صلاحیت کے اعتبار سے دیئے جاتے ہیں، ضروری نہیں ہے کہ ان کے لئے وہی شرعی احکام ہوتے جو انسانوں کے لئے ہیں، بہر حال ان مخلوقات نے اپنے عجز کا اظہار کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اس امانت کو اٹھانے کی ذمہ داری نہیں رکھی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی تخلیق کے بعد ان سے کہا: میں نے یہ امانت آسمان و زمین پر پیش کی، تو انھوں نے اس سے عاجز ہونے کا اظہار کر دیا، تو کیا تم اس کو اُٹھا سکتے ہو؟ اگر تم اس کو اٹھانے کا حق ادا کرو گے، تو تمہیں اس کا بہترین اجر عطا کیا جائے گا اور اگر تم نے اس امانت کا حق ادا نہیں کیا، ضائع کر دیا تو تم کو عذاب ہوگا، حضرت آدم نے اس کو قبول فرمالیا۔ (تفسیر ابن کثیر: ۳/۵۰۱) اس طرح دین و شریعت کے احکام انسان کے کاندھوں پر رکھے گئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَبَكَيْتُمْ وَكَثِيْرًا وَلَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا، يَظْهَرُ النِّفَاقُ، وَتُرْفَعُ الْاَمَانَةُ، وَتُقْبَضُ الرَّحْمَةُ وَيُتَّهَمُ الْاَمِيْنُ، وَيُؤْتَمَنُ غَيْرُ الْاَمِيْنِ، اُنَاخَ بِكُمُ السَّرَفُ وَالْحُوْبُ، قَالُوْا: وَمَا السَّرَفُ وَالْحُوْبُ، يَا رَسُوْلَ

اللّٰهِ قَالَ: الْفِتَنَ كَأَمْثَالِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ الْإِسْنَادِ وَلَمْ يُخْرِجَاهُ بِهٰذِهِ السِّيَاقَةِ (صحیح ابن حبان :٦٧٠٧)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم ان امور کو جانتے جن کو میں جانتا ہوں، تو کم ہنستے اور زیادہ روتے، پھر ارشاد فرمایا: (عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ) انفاق ظاہر ہو جائے گا، (منافقین کھل کر سامنے آئیں گے، جیسے بعض نام نہاد مسلمان یہود کے ایجنٹ کھل کر اسلام کے خلاف بولتے ہیں، اسلامی اقدار کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی اسلام دشمنی کو ترقی اور روشن مستقبل کا لبادہ پہناتے ہیں) امانت کو اٹھا لیا جائے گا (موجودہ زمانہ میں نہ حکمرانوں میں امانت نہ رعایا میں)، رحمت کو دلوں سے نکال لیا جائیگا، (لوگوں میں ہمدردی نہیں ہے ہر ایک کو کمانے کی فکر ہے، تاجر، طبیب ہر ایک کو اپنی دنیا کی فکر لوگوں کے بے بسی بے کسی اور محتاجگی سے ان کو کوئی لین دین نہیں)۔

امانت ایمان کا حصہ

امانت ایمان کا حصہ ہے، جو شخص اللہ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے، وہ امانت میں خیانت نہیں کرسکتا، اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اگر میں نے کسی کا حق دبا لیا یا اس کی ادائیگی میں کمی اور کوتاہی کی تو میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے، وہ یقیناً اس کا حساب لے گا اور اس دن جب کہ ہر شخص ایک ایک نیکی کا محتاج ہوگا، حق تلفی کے عوض میری نیکیاں دوسروں کو تقسیم کردی جائیں گی، پھر میری مفلسی پر وہاں کون رحم کرے گا؟ اس طرح کے تصورات سے اہل ایمان کا دل کانپ اٹھتا ہے اور پھر بندہ خیانت یا حق تلفی کرنے سے باز آجاتا ہے، لیکن جس کے دل میں ایمان ہی نہ ہو یا ماحول اور حالات نے ایمان کی روشنی سلب کرلی ہو تو خیانت کرنے میں ایسے شخص کو کوئی تردد نہیں ہوتا، اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت داری کو ایمان کی علامت اور پہچان قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں اور جس شخص میں معاہدے کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔ (سنن بیہقی:۱۲۶۹۰)

اللہ تعالیٰ نے امانت کو تقویٰ سے جوڑ دیا ہے یعنی جسے موت کے بعد کی زندگی

حساب و کتاب اور عدالت الٰہی پر یقین ہو، جس کے دل میں خوف خدا اور اس کی گرفت کا احساس ہو، اسے چاہیے کہ امانت میں خیانت نہ کرے جس کا جو حق ہے، پورا پورا ادا کر دے، اس لیے کہ اس دنیا میں خیانت کرنے والا قیامت کے دن چین و سکون سے نہیں رہ سکتا، وہاں ایک ایک کا حق ادا کرنا ہوگا اور بڑی دشواریوں کا سامنا ہوگا، لیکن جسے آخرت پر یقین نہیں، وہ جو چاہے کرے، دنیا میں چند روزہ زندگی کے بعد آخر اپنے کیے ہوئے پر افسوس ہوگا اور بڑے خسارے میں ہوگا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ زمانہ قیامت سے جیسے جیسے قریب ہوگا، ایمانی قوت کم ہوتی چلی جائے گی، اس کے نتیجے میں امانت بھی اٹھ جائے گی اور حال یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی بڑی آبادی ہوگی، مگر امانت دار بندہ پوری آبادی میں ایک آدھ بڑی مشکل سے دستیاب ہوگا اور وہ بھی حقیقت میں امین نہ ہوگا، لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانت دار شخص ہے، آدمی کی تعریف ہوگی کہ کیسا عقل مند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے، حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی۔ (صحیح بخاری)

معاشرہ میں امانت کی ناقدری

امانت کو آج معاشرے میں کوئی وزن نہیں دیا جاتا، اچھے اچھے لوگ بھی جو عرف میں دین دار سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی امانت اور حق کی ادائیگی کا پاس ولحاظ نہیں رکھتے، انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ امانت کی حفاظت اور اس کا مکمل طور پر ادا کرنا دینی و شرعی فریضہ ہے، بعض لوگوں میں امانت کا جذبہ ہوتا بھی ہے تو وہ صرف مال کی حد تک محدود رہتا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کسی کا مال رکھا ہو تو وہ اسے ادا کر دیتا ہے، عام طور پر لوگوں کا ذہن اسی مالی امانت کی طرف جاتا ہے، حالانکہ امانت کی اور بھی مختلف قسمیں ہیں، جن کی اہمیت بعض صورتوں میں مالی امانت سے بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے، ان کی حفاظت بھی ایک مسلمان کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی مالی امانت کی ہوتی ہے، اسی لیے فتح مکہ کے موقع پر خانہ کعبہ کی کنجی جب عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کو دینے اور ان کی امانت انہیں واپس

کرنے کی تاکید کی گئی تو امانت کو جمع کے صیغے کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ ارشاد باری ہے:

''اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مستحقین کو پہنچا دیا کرو۔'' (سورہ النساء:۵۸)

قابل غور بات یہ ہے کہ کنجی کوئی اہم مال نہیں، بلکہ یہ خانہ کعبہ کی خدمت کی نشانی ہے جس کا تعلق مال سے نہیں، عہدے سے ہے، پھر بھی اسے امانت سے تعبیر کیا گیا اور پھر جمع کا صیغہ استعمال کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ امانت کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، جن کی ادائیگی تمام مسلمانوں پر لازم ہے۔ عموماً ہمارے معاشرے میں [دین کے محدود تصور کی طرح] امانت کا مفہوم بھی مالی امانت کے ساتھ خاص سمجھ لیا جاتا ہے، عموماً اس کا دائرہ کار صرف ودائع کے طور پر رکھے جانے والے مال کی حفاظت کرنے اور اسے لوٹا دینے تک محدود کر لیا گیا ہے، عربی زبان میں "امانت" کے معنی کسی شخص پر کسی معاملے میں بھروسہ اور اعتماد کرنے کے آتے ہیں۔ (المعجم الوسیط)

شریعت کی نظر میں امانت کا دائرہ وسیع ہے

شریعت کی نظر میں امانت ایک وسیع مفہوم لفظ ہے جس کا خلاصہ ہر صاحب حق کو اس کا حق پورا پورا ادا کرنا اور اپنی ذمہ داری کو ٹھیک طرح سے نبھانا نکلتا ہے، قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کے ذخیرہ میں امانت کے لفظ کا اطلاق بہت سارے معانی اور ذمہ داریوں پر کیا گیا ہے، ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے بے وفائی نہ کرو اور نہ جان بوجھ کر اپنی امانتوں میں خیانت کے مرتکب ہونا۔'' (سورہ انفال)

یہ آیت غزوہ بنو قریظہ کے موقع پر نازل ہوئی جب حضرت ابولبابہ بن المنذر رضی اللہ عنہ نے اپنے اہل وعیال کے تحفظ کی غرض سے نبی کریم کے راز کو ظاہر کر دیا تھا، (اگرچہ بعد میں آپ کو سخت ندامت ہوئی، پھر اللہ رب العزت کی طرف سے معافی کا پروانہ بھی عطا ہوا) اس آیت میں راز فاش کرنے کو امانت میں خیانت قرار دیا گیا۔

اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی امانت کا اطلاق متعدد چیزوں پر ہوا ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں کچھ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک اعرابی نے آکر پوچھا: قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا: جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو، اعرابی نے پوچھا: امانت کا ضیاع کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب معاملات رمناصب نا اہل لوگوں کے سپرد کر دیے جائیں (صحیح بخاری)، اس حدیث پاک میں عہدے اور منصب پر امامت کا اطلاق کیا گیا۔ ترمذی شریف کی ایک روایت میں مشورہ کو امانت قرار دیا گیا۔ (اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ سنن الترمذی) اسی طرح ایک حدیث میں مجلس کی باتوں کو امانت کا درجہ دیا گیا ہے۔ (اَلْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ، سنن ابوداود) صحیح مسلم کی روایت کے مطابق میاں بیوی کے باہمی تعلقات بھی امانت ہیں۔ (صحیح مسلم)

ان آیات واحادیث کو ذکر کرنے کا مقصد شریعت کی نظر میں امانت کے وسیع مفہوم کی نشاندہی کرنا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امانت نہ صرف دھر ومہر کے طور پر رکھے جانے والے مال کی حفاظت کرنے اور اسے لوٹا دینے میں شامل ہے بلکہ ہر وہ چیز جو دوسرے کو اس بھروسے پر سپرد کی جائے کہ وہ اس کا حق ادا کرے گا، امانت ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ امانت دین کی تمام شرائط وعبادات کا نام ہے (تفسیر قرطبی)۔ امام رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: امانت کا باب بہت وسیع ہے چنانچہ زبان کی امانت یہ ہے کہ اسے جھوٹ، غیبت، چغلی، کثر و بدعت اور فحش گوئی وغیرہ سے بچایا جائے اور آنکھ کی امانت داری یہ ہے کہ اس کو حرام دیکھنے کے لیے استعمال نہ کیا جائے، اور کانوں کی امانت داری یہ ہے کہ لہو ولعب، بخش اور جھوٹ وغیرہ سننے میں انہیں استعمال نہ کیا جائے، امانت داری کی اہمیت وعظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امانت کو ایمان اور دینداری کا معیار اور کسوٹی قرار دیا گیا ہے: جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں"۔ (سنن بیہقی)

جس میں امانت نہیں اس کا کوئی دین نہیں

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ارفع یہ ہے کہ رب ذوالجلال نے آپ

کے امین ہونے کی گواہی دی، آپ ہی وہ انسان کامل ہیں جنہوں نے اس امانت کا بوجھ اٹھایا جو آسمان وزمین اور پہاڑ بھی۔ اٹھا سکے، آپ ہی ہیں جنہوں نے امانت کے حقوق ادا کر دکھائے اور آپ کے ماننے والوں کو بھی ی تعلیم دی کہ وہ مؤمن فلاح پا گئے جو اپنی امانتوں اور عہدوں کا خیال رکھتے ہیں، آپ نے فرمایا جس میں امانت نہیں اس کا کوئی دین نہیں، ایمان کا امانت سے گہرا تعلق ہے، ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کے بعد خلاف معمول تیزی سے گھر گئے اور ایک سونے کی ڈلی لے کر واپس آئے اور فرمایا کہ کچھ سونا آیا تھا سب تقسیم ہو گیا، یہ ایک سونے کی ڈلی بچ گئی تھی، میں جلدی اسے لے آیا ہوں کہ قومی مال میں سے کوئی چیز ہمارے گھر میں نہ رہ جائے، حفاظت امانت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا کہ غزوہ خیبر کے موقع پر یہود شکست کے بعد پسپا ہوئے، مسلمانوں کو طویل محاصرہ کے بعد فتح ہوئی، بعض مسلمانوں نے جو کئی دن سے فاقہ سے تھے، یہود کے مال مویشی پر غنیمت کے طور پر قبضہ کر کے کچھ جانور ذبح کئے اور ان کا گوشت پکنے کیلئے آگ پر چڑھا دیا جب آپ کو اس بات کی خبر ہوئی تو آپ سخت ناراض ہو گئے کہ مال غنیمت میں باضابطہ تقسیم سے پہلے یوں تصرف کیوں کیا گیا اور اسے آپ نے خیانت پر محمول فرمایا، آپ نے صحابہ کرام کو امانت کا سبق دینے کیلئے گوشت سے بھرے ہوئے وہ سب دیکھے اور ہنڈیاں الٹوا دیں پھر صحابہ کے مابین خود جانور تقسیم کئے اور ہر دس آدمیوں کو ایک بکری دی گئی، امانت ودیانت کی بنیاد نیک نیتی، دلی سچائی اور راست بازی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت داری کو ایمان کی علامت اور پہچان قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ، وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ (سنن بیہقی: ۱۲۶۹۰) جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس شخص میں معاہدہ کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم کے متعدد مقامات پر امانت داری کی تاکید فرمائی ہے، ارشاد باری ہے: فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ (بقرۃ: ۲۸۳) تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہیے کہ اپنی امانت ادا کرے اور چاہیے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

اِنَّ اَوَّلَ مَا تَفْقِدُوْنَ مِنْ دِيْنِكُمُ الْاَمَانَةَ، وَاِنَّ آخِرَ مَا يَبْقَى مِنْ دِيْنِكُمُ الصَّلَاةُ، وَلَيُصَلِّيَنَّ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ لَا دِيْنَ لَهُمْ ۔ (مصنف عبد الرزاق)

سب سے پہلی صفت جس کو تم دنیا سے غائب پاؤ گے، وہ امانت ہے اور دینی امور میں آخری زمانہ تک نماز کو پاؤ گے، لوگ نمازیں پڑھیں گے لیکن دیانت وامانت کا پاس ولحاظ نہیں کرتے ہوں گے۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے دو حدیثیں فرمائی ہیں، ایک حدیث کا مصداق میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے، دوسری حدیث کے مصداق کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امانت (اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے) لوگوں کے دلوں میں اتر جائے گی، لوگ قرآن اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو جائیں گے، پھر ان پر عمل پیرا ہوں گے (صحابہ کرام کی زندگی میں اس حدیث کے مصداق کو پالیا ہے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (رفع امانت کے بارے میں) ارشاد فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ امانت دنیا سے اٹھالی جائے گی، امانت کا اثر باقی رہ جائے گا، جیسے آگ کی وجہ سے کوئی زخم جسم پر آئے اور مندمل ہو جانے کے بعد جسم کے اس حصہ پر داغ کا اثر پڑ جاتا ہے، (کھال کا اصلی رنگ زائل ہو جاتا ہے، اور دھبہ بہت دنوں تک باقی رہتا ہے، اسی طرح امانت کی حقیقت ختم ہو جائے گی، ظاہری آثار باقی رہ جائیں گے)۔

يُصْبِحُ النَّاسُ يَتَبَايَعُوْنَ، فَلَا يَكَادُ اَحَدٌ يُؤَدِّي الْاَمَانَةَ، فَيُقَالُ: اِنَّ فِيْ بَنِيْ فُلَانٍ رَجُلًا اَمِيْنًا، وَيُقَالُ لِلرَّجُلِ: مَا اَعْقَلَهُ وَمَا اَظْرَفَهُ وَمَا اَجْلَدَهُ، وَمَا فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِنْ اِيْمَانٍ۔

لوگ کاروبار کریں گے، کوئی امانت دار نہیں ہوگا لوگ کہا کریں گے کہ فلاں ملک میں فلاں شہر میں فلاں بستی میں ایک امانت دار شخص رہتا ہے، (یعنی سب لوگ خائن ہو جائیں گے، خال خال ہی امانت دار پائے جائیں گے) لوگ کسی کی تعریف کرتے ہوئے

کہیں گے: فلاں شخص کس قدر عقل منداور چالاک اور باہمت ہے؛ حالانکہ اس کے دل میں ذرہ برابر ایمان نہیں ہوگا۔ (رواہ البخاری عن حذیفہ، کتاب الرقاق، باب رفع الامانۃ: ۶۴۹۷)

امانت انبیاء کرام علیہم السلام کی صفات میں سے ہے، ہمیں بھی انہیں اوصاف کے حصول کے لئے جدوجہد اور محنت کرنے کی ضرورت ہے، ہمارے اطراف میں خاندان میں معاشرہ اور اہل وعیال میں امانت داری اور صداقت کے پیغام کو عام کرنا ہے، اپنی زندگی میں نافذ کرنا ہے تاکہ جو لوگ ہمارے ہمراہ چل رہے ہیں ان کے سامنے صداقت وامانت معاملات میں صفائیت اور وضاحت کو اپنا وطیرہ بنائیں، شک اور بے اعتمادی کا ماحول پیدا نہ ہونے دیں، آیئے اہل وعیال خاندان دوست احباب آپ کے مشوروں کو اسی لحاظ سے قبول کریں گے کیونکہ سچائی اور اعتماد اور امانت داری دلوں کو کھولنے کا سب سے اہم راستہ ہے لوگوں کو آپ پر اسی قدر بھروسہ ہونا چاہئے اور صداقت وامانت کی دعوت وتبلیغ کے لئے ہمہ وقت مصروف بہ عمل رہنا چاہئے، اسلامی تعلیمات سے واقف ہونے اور واقف کرانے کی سعی میں مسلسل کوشاں رہنے کی ضرورت ہے اصلاح کا عمل اپنی ذات سے شروع کرنے کی دعا اور توفیق باری تعالی سے طلب کرنی چاہئے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا